ستمگر ستمبر
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
نیلم احمد بشیر

ستمگر ستمبر

رپورتاژ

نیلم احمد بشیر

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
اردو بازار لاہور

Al-Faisal Nashran
Ghazni Street,Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone:7230777 Fax:09242-7231387
http://www.alfaisalpublishers.com
e-mail:alfaisal_pk@hotmail.com

ٹائیٹل
مارک فلپس کی کھینچی ہوئی تصویر جس کے
دھوئیں میں شیطانی شبیہہ نظر آ رہی ہے

جنوری 2003ء
محمد فیصل نے
تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت =/120روپے

Email:neelambasheer@hotmail.com

بچپن کی میٹھی یاد

اپنے دادا اور دادی کے نام
جنہیں پڑھتے لکھتے دیکھ کر
مجھ میں بھی حرف کی محبت جا گی۔

ہم بھی وہیں موجود تھے

امریکہ سے میرا تعلق تقریباً تیس سال پرانا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی سے نکلتے ہی میری شادی ہوگئی اور میں ایک نئے انجان ملک کو روانہ ہوگئی۔ سفر میرا مقدر ٹھہرا۔ تب سے لے کر آج تک میری جیون نیّا، امریکہ اور پاکستان کے درمیان مستقل ہچکولے کھاتی کبھی ایک کنارے کو ڈھونڈتی اور کبھی دوسرے سے جا لگتی رہی۔ سفر کرتے کرتے اب تک میں بہت سے براعظم پاٹ چکی ہوں۔ وقت کا سانپ سرسراتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے اور اب لگتا یہ ہے کہ دونوں ملک میرے ہیں اور میرے نہیں بھی۔ میں ان دونوں ملکوں کی شہری ہوں اور دونوں میں پردیسی بھی۔ ایک میرا میکہ، ایک میرا سسرال۔ ایک میرا ماضی اور ایک میرا حال ہے۔

امریکہ ہجرت کے بعد کے ابتدائی سال میں نے نیویارک سٹی میں گزارے۔ نیویارک ہی میرے لیے امریکہ تھا۔ نئی سرزمین پہ میرا شہر اور میرا گھر تھا۔ پھر ایک روز میں اور میرے ننھے بچے نیویارک سٹی سے بہت دور اپ سٹیٹ نیویارک کے ایک چھوٹے سے قصبے سالامانکا میں زندگی گزارنے چلے گئے۔ قدرتی مناظر سے مالا مال اس خوبصورت علاقے میں زندگی سست روی سے چلتی تھی۔ پہاڑ گم صم کھڑے رہتے اور جنگل مجھے گھورتے تھے۔ ندیاں دھیمے سُروں میں بہتیں اور جھرنے اٹکھیلیاں کرتے دور نکل جاتے۔ یہی میرا ماحول اور یہی میری زندگانی تھی۔ سالہا سال ہم نے اسی قصبے میں چپکے سے بتا دیئے اور وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ میرے بچے بیشتر امریکی قصباتی بچوں کی طرح پینڈو یعنی Hillbillies بن چکے تھے۔ مگر اب کچھ بڑے ہونے کے بعد انہیں بھی نیویارک سٹی دیکھنے کا شوق ہو رہا تھا۔ ان کے دوست بھی ان قصباتی خاندانوں سے تھے جو اپنے طرز زندگی سے اتنے مطمئن اور شہری

زندگی سے اتنے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ اپنے محدود دائرے سے نکلنے کی خواہش بھی نہیں رکھتے وہ نیویارک یا اور کوئی بڑا شہر دیکھے بغیر پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ میرا تو اپنا دل ہمیشہ سے نیویارک پہ بے ایمان رہتا تھا۔ اس لیے ایک بار بچوں کی فرمائش کو بہانہ بنایا اور نیویارک یاترا کے خیال سے خوش ہوگئی کہ وہ شہرِ بے مثال مجھے ہمیشہ ہی بہت اچھا لگتا تھا۔

یہ ۱۹۸۵ء کا سال تھا اور ستمبر کا مہینہ۔ آج اس وقت کو بیتے کئی سال ہو چکے ہیں۔ بہت سا پانی پُلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہے لیکن اپنے بچوں کے بچپن میں ان کے ساتھ گزارے ہوئے وہ یادگار لمحے میں کبھی بھلا نہ پاؤں گی کیونکہ اس وقت وہ بچے تھے اور آج بہت بڑے ہوگئے ہیں۔ تب اپنی ہر ضرورت کے لیے میرے محتاج تھے۔ میری طرف دیکھتے تھے اور آج میں ان کی محبت اور توجہ کی محتاج ہوں اور ان کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ ان کی صحت اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ طیارہ نیویارک سٹی کے عین اوپر پرواز کر رہا تھا۔ سب مسافر اشتیاق سے نیچے دیکھ رہے تھے۔ رنگ اور روشنی کا ایک سیلاب سا بہہ رہا تھا۔ جگمگ کرتی جلتی بجھتی روشنیوں اور جھلمل کرتے ستاروں کے درمیان طیّارہ جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی ایک ستارہ بن کر ہمیشہ کے لیے وہیں ساکت ہو جاتا۔ کپتان کی آواز کانوں میں سنائی دی۔ ''ائیر ٹریفک کی زیادتی کی وجہ سے ابھی لینڈنگ کی اجازت نہیں مل سکتی۔ ہمیں ابھی کچھ دیر اور یونہی اڑتے رہنا ہوگا' اس لیے آپ لوگ نیویارک کے نظارہ ہائے دلنشیں سے دل بہلائیں' روشنیوں کی جادوگری دیکھیں۔''

''اف یہ انتظار!'' دل نے احتجاج کیا۔ نیویارک کے ٹچ ڈاؤن کا کتنا انتظار تھا مجھے اور دوسرے مسافروں کو۔ سب بے چینی سے اپنی اپنی نشستوں پہ پہلو بدل رہے

تھے۔ نیو یارک امریکہ کا گیٹ وے، جب تک مسافروں پہ اپنے دروازے نہیں کھولتا کسی کو یقین نہیں آتا کہ وہ امریکہ پہنچ چکے ہیں۔ ان کی بے قراریاں سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ دلوں کی بے کلی ان کے چہروں کو زرد بنا دیتی ہے۔ مگر مجبوری کے عالم میں سبھی صبر کیے بیٹھے تھے۔ شاید کسی ایسے ہی لمحے کے لیے، مشہور امریکی گلوکار Christopher cross نے یہ نغمہ تخلیق کیا تھا:

When You get lost betwen the moon and New York city

the best that you can do is..... fall in Love.

یعنی جب آپ چاند اور نیو یارک سٹی کے بیچوں بیچ گم ہو جائیں تو سب سے اچھی بات یہی ہو سکتی ہے کہ محبت کر لی جائے۔

میں بھی اس وقت نیو یارک کی محبت میں گرفتار تھی کیونکہ وہ شہر میرا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے کچھ نئے نئے اور معصوم سال اس شہر کے تاج میں سجائے تھے۔ اس کی گود میں سر رکھ کر پناہ ڈھونڈی تھی۔ وہ امریکہ میں میرا پہلا واقفِ حال اور راز دار میرا اپنا شہر تھا۔ میں نے کرسٹوفر کراس کے اس خوبصورت نغمے کو اپنی پیاسی آنکھوں میں دھیرے سے سمو کر انہیں زور سے بند کر لیا، اس ڈر سے کہ اگر وہ آنسو بن کر باہر بہہ نکلا تو سب کو خبر ہو جائے گی کہ ایک مسافر ایسا بھی ہے جو محبّت کے ذکر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگ جاتا ہے اور پھر خود کو سمیٹ نہیں پاتا۔

سولہ برس پہلے جب میں پہلی پہلی بار اسی طرح ایک تاریک رات کو جہاز میں بیٹھی ایک اجنبی شہر کی رنگا رنگ روشنیوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی تو اس وقت میرے پاس یہ نغمہ نہیں تھا بلکہ کوئی بھی نغمہ نہیں تھا۔ میری آنکھیں خالی تھیں، کیونکہ پہلی پہلی بار وطن اور اپنے پیارے چھوڑنے کے غم میں سارے آنسو میری آنکھوں سے بہہ کر رخصت ہو چکے تھے اور اب ان میں حیرانی اور ویرانی بسی تھی۔

نیو یارک اس رات بھی دلہن کی طرح ہی جگمگا رہا تھا۔ اس حقیقت سے بے نیاز کہ اس کے اوپر پرواز کرنے والے ایک طیارے میں دور دیس سے آنے والی ایک نئی نویلی دلہن بیٹھی ہے جس کے ماتھے پہ خوابوں کا جھومر اور گلے میں آرزوؤں کے ہار جھول رہے ہیں۔ اخلاق کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک نئی مہمان کی خاطر اس کی پذیرائی کے تقاضے میں البیلا شہر اپنی کچھ روشنیاں کچھ دلآویز جھلملاہٹیں کچھ دیر کو ہی مدھم کر دیتا اور نئی نویلی دلہن کو بھی کچھ چمکنے دمکنے کا موقعہ دے دیتا' مگر شہر اتنے رحم دل کہاں ہوتے ہیں۔ وہ حسب معمول چمچماتا رہا۔

سالوں پہلے کی بھولی بھالی دلہن کا اس جہاز میں دور دور تک سراغ نہیں ملتا تھا۔ اب جو اس میں سوار تھی' زمانہ دیکھے ہوئی' سرد گرم چشیدہ' ایک بال بچے دار عورت تھی جس کے دل میں پہلے کی طرح انجان منزلوں کا اشتیاق اور امیدوں کی پر چھائیاں رقص نہیں کرتی تھیں' اپنے بال بچوں کے ساتھ سیر و سیاحت کی آرزو تھی اور بس۔ انہیں نیو یارک سٹی دکھانے کے ساتھ ساتھ جو خود بھی اس شہر سے دوبارہ شرفِ ملاقات حاصل کرنے کا شوق رکھتی تھی۔ پرانی جگہوں پہ جا کر خود اپنے آپ کو دوبارہ کھوجنے کی خواہش اپنے دل میں پاتی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ میرے تینوں بچے میری ساتھ کی نشستوں پہ ادھ سوئے ادھ جاگے سے پڑے ہوئے تھے۔ وہ نئی نویلی دلہن بھی پلکیں جھپکا جھپکا کر شرمیلی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جو پندرہ سال پہلے ایک اجنبی کی انگلی تھامے نئے دیس کو جانے والے جہاز میں بیٹھ کر اڑ گئی تھی۔ نہ جانے کس ائیر پورٹ پر اتر گئی تھی وہ؟ دھند اتنی زیادہ تھی کہ اس کا پھر کبھی سراغ ہی نہیں مل سکا۔

جس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں ہم رہتے تھے وہاں خاصی تعداد میں انڈین خاندان آباد تھے مگر میں اپنی پاکستانیت کی وجہ سے کسی کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ مہینے گزر گئے' اپنوں

سے دُوری کا زہر رگ رگ میں سرایت کر گیا۔تنہائی کے ناگ نے جب موقعہ ملا مجھے خوب خوب ڈسا، میں نیلی ہو کر اکڑ جاتی مگر کسی انڈین ہمسائی سے ملنے نہ جاتی کیونکہ یہ قومی انا کا مسئلہ تھا۔ میں پاکستانی تھی اور بہت غیور محبّ وطن پاکستانی۔سارا سارا دن اکیلی گھر میں قید رہتی تھی۔

ایک روز کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ایک انڈین بچہ ہاتھ میں پلیٹ لیے کھڑا تھا۔

''اماں نے سوجی کا حلوہ بھیجا ہے۔'' وہ پلیٹ پکڑا کر بھاگ گیا اور میں نمکین پانی ملا میٹھا سوجی کا حلوہ کھانے لگی۔ایک اجنبی کی مہربانی اور دوستی نے ضبط کے تمام بندھن توڑ دیئے۔ میں نے شکرادا کیا اور پلیٹ واپس کرنے کے بہانے اس انڈین عورت کے گھر جا کر گھنٹوں گزار دیئے۔اسی لمحے میں نے پہلی بار یہ سیکھا کہ قوم پرستی ضروری جذبہ ہے لیکن انسانیت اور انسان دوستی ایسے سب جذبوں سے اہم اور مقدم ہے۔ انسانیت کا رشتہ ہی سب سے ضروری اور کارآمد رشتہ ہے۔ باقی سب باتیں بعد میں آتی ہیں۔

نیویارک سِٹی نے میرے ذہن کے بند دریچے کھول دیئے۔ میں تقسیم کے بعد کی نسل تھی، انڈین لوگوں کو قطعاً نہیں جانتی تھی لیکن جب آہستہ آہستہ انڈین، بنگلہ دیشی اور سکھ لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا تو ایک اندرونی ربط کا احساس ہونے لگا کہ وہ بھی اپنے جیسے ہی تھے۔تبھی سے میں نے یہ بھی جان لیا کہ کبھی کبھار اپنوں کی نسبت اجنبیوں کی مہربانیوں پہ زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔زندگی میں بارہا ایسا ہوا اور یہ حقیقت سچ ثابت ہوئی۔

☆☆

ہم نیویارک ایئر پورٹ سے ٹیکسی میں مین ہٹن کے مشہور ہارورڈ جانسن ہوٹل کی

طرف جا رہے تھے۔ اتنے بہت سے سالوں بعد میں نے گاڑی کو کوئینز بولیوارڈ پہ دوڑتے دیکھ کر کلیجے میں ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس کی۔ یہ وہ سڑک تھی جہاں ۱۹۷۲ء میں پاکستان سے آنے کے بعد نویلی دلہن نے پہلی بار گاڑی چلانا سیکھی تھی۔ اس کا ڈرائیونگ کے بعد قریبی بڑے بڑے سٹورز میں یونہی بلاوجہ وقت گزاری کے لیے گھومتے پھرتے رہنا' سڑک کنارے لگے بنچوں پہ بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے رہنا' کتنا عجیب تھا وہ سب کچھ' کتنی اکھڑی اکھڑی ہوئی محسوس کرتی تھی وہ' اور اب سب کچھ کتنا بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی بھولی ہوئی داستان' گزرا ہوا خیال یا نیند کی وادی سے گر کر ٹوٹ جانے والا خواب ہو۔

شاید وقت نے میرے اندر ہی تبدیلی پیدا کر دی تھی اور اب میں جاننا چاہتی تھی کہ اتنے عرصے بعد اس شہر میں دوبارہ لوٹ آنے کے بعد کیا مجھے بھی نیویارک مختلف لگے گا یا نہیں؟ کیا یہ شہر بھی میری طرح رویّوں' نظریوں' جذبوں اور محسوسات کی تبدیلیوں سے گزر چکا ہے یا نہیں؟ کیا اب بھی رات گیارہ بجے کی خبروں سے پہلے ٹی وی اناؤنسر سامعین' ناظرین سے پوچھتا ہے:

It is 11 pm

Do you know where your children Are?

یہ سوال! ''کیا آپ جانتے ہیں اس وقت آپ کے بچے کہاں ہیں؟''

اُس زمانے میں تو میرے بچے ننھے ننھے تھے اور مجھے اس سوال کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر بھی یہ سوال سنتے ہی خون میرے بدن میں جمنا شروع ہو جاتا تھا۔ اب میرے بچے کچھ بڑے تھے اب تو یہ سوال سن کر میرے تن بدن میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ ابھی میرے بچے میرے پاس تھے' محفوظ تھے' لیکن کیا میں انہیں آنے والے وقتوں میں بھی گیارہ بجے سے پہلے اپنے محفوظ ٹھکانوں پہ پا کر

چین کی نیند سو سکوں گی؟ اس سوال کا جواب میرے پاس کہاں تھا۔ کتنے بے بس ہو جاتے ہیں والدین جب ان کے بچے گھونسلے سے اڑ جاتے ہیں اور پھر وہ اُن کی صحت سلامتی کے خدشات میں گھرے، بس اُن کے لیے دعائیں ہی مانگتے رہ جاتے ہیں۔
نیویارک سٹی کے پانچوں Boroughs کوئینز، برانکس، بروکلین اور مین ہٹن میں سب سے زیادہ منفرد، دلچسپ اور انوکھا بورو مین ہٹن کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ درحقیقت مین ہٹن کو ہی سٹی کہا جاتا ہے کیونکہ بڑی بڑی خوبصورت شاہراہوں، عظیم الشان سکائی سکریپرز، تھیٹرز، دفاتر اور زندگی سے بھرپور ہنگاموں والا یہ جزیرہ دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔
دن کے سفر کے ساتھ ساتھ سورج کے گھٹنے بڑھنے سے شیشوں کے محلوں جیسی عمارات پہ رنگ برنگے عکس ایک حسین ڈراما پیش کرتے ہیں۔ مین ہٹن ہی وہ تاریخی جزیرہ ہے جہاں یورپ سے تارکین وطن بحری جہازوں میں سے آ کر اترا کرتے تھے۔ انگلینڈ، ہالینڈ، آئرلینڈ، اسرائیل، عربستان غرضیکہ دنیا کے کونے کونے سے مسافر بہتر زندگی کی تلاش میں اس نئے ملک میں قسمت آزمائی کو آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ بہت سے لوگ نیویارک میں یعنی پہلے پڑاؤ پر ہی رک جاتے اور اسے ہی گھر بنا لیتے۔ اسی لیے نیویارک مختلف قومیتوں، نسلوں، مذاہب کا Melting Pot کہلایا یعنی ہر مسالہ اور ذائقہ کی ایک ہانڈی بن گیا اور ایک ملا جلا کلچر وجود میں آیا۔
اگرچہ رات خاصی ہو چکی تھی مگر ہوٹل کی گیارہویں منزل کی کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے قطعاً یہ احساس نہیں ہوتا تھا۔ دنیا بھر کے لوگوں کی پسندیدہ سٹریٹ براڈ وے سامنے ہی تھی جس پہ ہمہ وقت تھیٹر، کانسرٹ سٹیج ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ اُن کی ٹکٹ خریدنے کے لیے بہت پہلے پیشگی بکنگ کروانا پڑتی ہے کیونکہ انھیں دیکھنے بہت لوگ آتے ہیں۔ ایک ایک ڈراما کئی سالوں تک چلتا ہے مگر لوگ اس سے اُ

کتاتے نہیں۔ تھیٹروں کے سامنے کی طلسماتی جلتی بجھتی بتیاں دیکھنے والوں کو کسی اور ہی دنیا میں لیے جاتی تھیں۔ کار پارکنگ نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ پیدل چلتے نظر آ رہے تھے۔ اتنی رونق اور چہل پہل دیکھ کر لگتا تھا شاید شام ابھی ابھی شروع ہوئی ہے یا شاید شام یہاں کبھی ختم ہی نہیں ہوتی، مسلسل چلتی رہتی ہے۔ ایسی ہی جگمگاتی راتوں کی شان میں فرینک سناٹرا نے اپنا مشہور و مقبول گانا ریکارڈ کروایا تھا جس کے بول کچھ یوں تھے:

''نیو یارک نیو یارک۔ میں ایک ایسے شہر میں جاگنا چاہتا ہوں جو کبھی نہیں سوتا۔''

مجھے پیدل چلنے کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے۔ ایک دن بھی واک نہ کروں تو لگتا ہے ذہن بند ہو جائے گا، دل تھم جائے گا۔ مجھے یاد آنے لگا، ۱۹۷۲ء میں جب نئی نئی نیویارک میں رہنے لگی تو سارا سارا دن گھر میں پڑے پڑے جی اکتا جاتا۔ پیدل چلنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ آسمان زیادہ تر ابر آلود رہتا تھا مگر ایک شام کالے سرمئی آسمان پہ گوٹے کے چمکتے پھولوں جیسے تارے چمکتے دیکھے تو اپنا دیس بے طرح یاد آنے لگا۔ رومان پسندی تو طبیعت میں ہمیشہ ہی سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لہٰذا ایسا سماں دیکھ کر اپنے جیون ساتھی کا بڑے لاڈ سے بازو پکڑا اور اٹھلا کر فرمائش کی۔ ''چلیے ذرا واک کر آتے ہیں۔'' مردِ مخاطب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ ایک کڑوی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پہ کھیل گئی اور بولے ''ابھی نئی نئی ہو نا اس لیے تمہیں پتہ نہیں۔ نیویارک میں رات کو واک جیسی بیوقوفانہ بات کا تذکرہ آئندہ کبھی زبان پہ نہ لانا۔'' ''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ رات کو مگرز یعنی چور اُچکے کھلے پھرتے ہیں۔ کوئی کالا، گورا، ہسپانوی mugger مگر اگر ٹکرا گیا تو پرس تو بعد میں چھینے گا پہلے آپ کو دوسرے جہاں پہنچائے گا تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری......

''یااللہ یہ ''مگر مچھے'' امریکہ میں خشکی پہ کب سے ڈاکے مارنے لگے۔'' میں نے حیران ہوکر سوچا۔ کیا جانتی تھی کہ امریکی چورا چکوں کے لیے mugger کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ Thief وغیرہ سے کچھ آگے کی چیز ہوتے ہیں۔ ایک معصوم سی خواہش کے اتنے خطرناک نتائج سن کر میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اپنی خواہشِ آوارگی کو دل کے نہاں خانوں میں دفن کر کے چپکی ہو رہی۔

یاد آ گیا کہ کچھ دن پہلے ہی اخبار میں آیا تھا کہ اپنا ماہانہ بجٹ بناتے وقت اپنے محلّے کے حساب سے ''مگرالاؤنس'' کا خیال رکھنا نہ بھولیں۔ ''ہدایات نامہ مگر'' mugger میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بٹوے میں خالی کریڈٹ کارڈز رکھنے سے آپ ''مگر صاحب کے جذبات کو مجروح کر سکتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ آپ کو زخمی یا زندگانی سے فارغ بھی کر سکتا ہے۔ تھوڑا بہت کیش رکھ کر گھومیئے تا کہ جان کی امان پائیں۔

صبح ہوئی تو میں نے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر پندرھویں منزل سے نیچے جھانکا۔ ہمارے ہوٹل کے بالکل سامنے، سڑک کے پار نچلی منزل پہ ایک ''ڈیلی'' Deli دکھائی دی، جس میں سے لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈیلی ایک چھوٹا سا گردسری یا سینڈوچ سٹور ہوتا ہے جسے گلی کے کباپیئے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ڈیلی کے سینڈوچ عوام میں بہت مقبول ہوتے ہیں اس لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے جس نے نیویارک کی کسی ڈیلی کا سینڈوچ نہیں کھایا وہ گویا نیویارک ہی نہیں آیا۔ یعنی جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں نے اپنی بڑی بیٹی عنبر سے کہا ''چلو نیچے چل کر ڈیلی سے دودھ، جوس، ڈبل روٹی وغیرہ لے آتے ہیں۔'' اور ہم دونوں لفٹ کے ذریعے نیچے اتر گئیں۔

میں نے چند ٹونافش سینڈوچز کا آرڈر دیا اور ان کے بننے کے انتظار میں ہم دونوں

ادھر ادھر کی چیزوں کو دیکھتے، آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ لوگ سودا خرید کر جس میں اخبار، سگریٹ، کینڈی وغیرہ شامل تھی، آپس میں ایک دوسرے کو "گڈ مارننگ" "Hi" وغیرہ کہہ کر گزر رہے تھے۔ کاؤنٹر پہ کھڑا اسٹور کیپر خاموشی سے سینڈوچ بنا رہا تھا کہ یکدم میں نے عنبر سے کہا:

"اوہو میں نے اس کو یہ تو بتایا نہیں، کہ سینڈوچ میں ڈھیر ساری کالی مرچ ڈال دے۔"

"اب کھائیں پھیکا سینڈوچ۔" عنبر نے ہنس کر کہا۔

وہ تو میں نے پہلے ہی ڈال دی تھی۔" سینڈوچ میکر نے دھیمے لہجے میں اردو میں جواب دیا۔

"ہائیں؟" ہم دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ؟ پاکستانی ہیں؟"

"جی میں لاہور سے ہوں۔" وہ پھر مسکرایا۔

"اچھا...... میری باچھیں کھل گئیں۔ نیویارک میں حالانکہ پاکستانیوں کا نظر آنا کوئی اتنے اچنبھے کی بات نہیں مگر پھر بھی ہم وطن کی کچھ ایسی کشش ہوتی ہے کہ میں اس سے بات چیت کیے بغیر نہ رہ سکی۔

پھر اسّی کی دہائی ہی میں وہ وقت آیا جب نیویارک کے ہر ڈیلی سٹور، ریسٹورنٹ، گیس سٹیشن، (پٹرول پمپ) پہ پاکستانی اور انڈین لوگ کام کرتے نظر آنے لگے۔ تب سے لے کر اب تک ایسا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ دراصل برصغیر کے اور دیگر ایشیائی ممالک کے لوگ اتنی لگن، جانفشانی اور محنت سے ہر طرح کے کام کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ وہ با آسانی کسی نہ کسی نوکری میں کھپ جاتے ہیں۔ وہ اپنے ملک سے آتے ہیں تو اپنی کشتیاں جلا دیتے ہیں اور پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ بزنس کے مالکان انہیں

اس لیے ملازم رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ گورے کالے امریکی افراد کی طرح ان کے نخرے اور مطالبات نہیں ہوتے۔ امریکیوں کو رکھیں تو ان کی ہیلتھ انشورنس، بیروزگاری الاؤنس، فکسڈ اوقات کے اصولوں کی وجہ سے مالکان کو زیادہ خرچہ کرنا پڑتا ہے جبکہ دیسی لوگ ان سب لوازمات کے بغیر بھی کام کرنے پہ رضامند ہو جاتے ہیں۔ وہ طرح طرح کی مشکلات جھیلتے، تنہائیوں کے طوق گلے میں ڈالے اپنے خاندانوں کی کفالت میں دن رات ایک کر دیتے ہیں۔

ان کے گھر والوں کو اِن ''بندۂ مزدور کے تلخ اوقات'' کا قطعاً اندازہ نہیں ہوتا اور وہ یہ سمجھ کر بے فکر ہو جاتے ہیں کہ جس درخت پہ ڈالرا گتے ہیں اسے کبھی خزاں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا نہ ہی اس کے پھول کبھی مرجھاتے ہیں۔ اس پہ ہمیشہ بہار آتی رہتی ہے۔

نئ نویلی دلہن نیویارک کے اپارٹمنٹ میں سارا سارا دن اکیلی پڑی رہتی تو کبھی کبھی اپنے آپ سے سوال پوچھتی ''میں کہاں آ گئی ہوں؟ میں کس کے ساتھ اور کس کے پاس ہوں؟'' بلڈنگ کے ڈاکیے کو علم تھا کہ اسے نیلے رنگ کے ایروگرام کا انتظار رہتا ہے۔ پاکستان سے آیا ہوا گھر والوں کا بھیجا ہوا خوبصورت نیلا ایروگرام وہ ہزاروں بار پڑھتی اور تکیے کے نیچے کسی کتاب کے مانند رکھ چھوڑتی۔ جس روز نیلا خط نہ آتا ڈاکیہ جھوٹ موٹ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے کا اشارہ کر کے اسے ہنسا دیتا اور وہ ہنستی روتی گڑیا کی طرح کبھی ہنستی اور کبھی رو دیتی۔

امی کے خط پڑھ کر میں اپنے بہن بھائی کے بارے میں خبریں جان کر حیران اور خوش ہوتی۔ ''اچھا تو پپو کی منگنی ہوگئی ہے! گوپی ٹی وی فنکارہ بننے جارہی ہے! مانو نے میٹرک کرلیا ہے۔ ہمایوں میرے بغیر اکیلا ہو گیا ہے۔ دوسری بہنوں سے قابو میں نہیں آتا، پڑھائی نہیں کرتا۔ اچھا!'' یہ سب لوگ میرے بغیر ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں،

حیرت ہے۔اور میں ان کے بغیر خود کو ہر پل کتنا اکیلا محسوس کرتی ہوں۔ان کی یادمیں گم رہتی ہوں۔ پھرآہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے جان لیا کہ بھری محفل میں سے صرف ایک شخص کے چلے جانے سے محفل کی رنگینی اور ہما ہمی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔کارواں چلتا رہتا ہے سمے بیتتا رہتا ہے۔غالبِ خستہ کے بغیر کبھی کوئی کام بند نہیں ہوتا۔مگر وہ شروع سّتر کی دہائی کی باتیں تھیں اوراب اسّی کی دہائی کا زمانہ تھا۔

خط کم کم لکھے جانے لگے تھے اور ٹیلی فون کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا مگر مجھے فون سے کسی طور تسلی نہ ہوتی تھی اکہ ٹیلی فون پہ کی گئی گفتگو Instant food کی طرح فوری لذت تو دے دیتی ہے مگر زبان سے نکلے شبدوں کو آپ نیلے خط کی طرح چھو نہیں سکتے۔نہ چوم کرآنکھوں سے لگا کر تصورات کی دنیا میں گم ہو سکتے ہیں' نہ وہ بعد آپ کے مرنے کے آپ کے گھر کے سامان سے نکل کر آپ کا اثاثہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔خط لکھنا اور جواب پانا ایک ایسی خوشی ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ٹیکنالوجی کی ترقی خط نویسی کے آرٹ کی موت کا سندیسہ لائی ہے مگر آج کے دور میں تو اس حادثہ پہ کوئی ماتم کناں بھی نظر نہیں آتا۔

بچے نیویارک کی سیر سے بہت خوش ہو رہے تھے۔ ایک روز انھوں نے بھی ہر نو وارد کی طرح مجسمۂ آزادی دیکھنے کی فرمائش کی کیونکہ اسے دیکھے بغیر نیویارک کی سیر مکمل ہی نہیں سمجھی جاتی۔ پتھر کی بنی ہوئی طویل قامت "لیڈی لبرٹی" کو ہڈسن دریا میں کھڑے ہوئے برسوں بیت چکے ہیں مگر اس کے چہرے پہ کھیلنے والی مدہم سی مسکراہٹ اور ہاتھ میں جلتی ہوئی شمع آج بھی پہلے دن کی طرح ہی فروزاں ہے۔ اس سبز تن مجسمے کی زیریں منزل پہ کندہ یہودی شاعرہ Emma Lazarus کی نظم کی یہ سطر ہر تارک وطن کے لیے زندگی کی نوید کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے یہ الفاظ "مجھے اپنے تھکے ہوئے اور بھوکے لوگ دے دو۔"

Give me your tired and your hungry.

جب تارکین وطن کو اس نئی سرزمین پہ قدم رکھنے کے بعد لیڈی لبرٹی سے ایسے ماں جیسے جذبات ملتے ہیں تو ان کے دلوں میں توصلہ اور نیا ولولہ پیدا ہو جاتا ہے، وہ اس نئی دھرتی کو اپنا گھر سمجھنے اور بنانے کی کوشش میں بھرپور جذبے کے ساتھ جُٹ جاتے ہیں۔ امریکہ کی ایسی فراخدلانہ باتیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں یہ غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جس نے دنیا کے ہر ملک اور مذہب کے لوگوں کو اتنی تعداد میں اپنی سرزمین پہ آنے دیا اور قسمت آزمائی کرنے دی اور اسی لیے Immigrants کا ملک کہلایا۔

لبرٹی آئی لینڈ پہنچ تو لمبی قطار دیکھ کر جی ہول گیا۔ اس روز نیو یارک میں نوّے ڈگری ٹمریچر تھا یعنی قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ لوگ ننگ دھڑنگ Its too hot چلاتے پھر رہے تھے۔ ایسے ہی گرم دن ہوتے ہیں جب امریکن بیبیاں یہ کہہ کر کچن

میں گھسنے سے انکاری ہو جاتی ہیں کہ اتنی گرمی میں ہم سے کھانا نہیں پکایا جاتا۔ ایسے میں نیک طینت امریکی خاوند خوشی خوشی ایپرن باندھ لیتے ہیں اور لان میں باربی کیو کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے شوہروں کی طرح ہاتھ میں ڈنڈا نہیں پکڑ لیتے۔

قطار میں کھڑے لوگوں سے پوچھنے پہ پتہ چلا کہ مجسمے تک پہنچنے کے لیے جو کشتی آتی ہے اس کے لیے کم از کم ایک گھنٹہ انتظار کرنا ہوگا۔ جزیرے پہ پہنچنے کے بعد مجسمے کے اندر جا کر اوپر کی منزل تک کا انتظار کم از کم دو گھنٹے' پھر واپسی کے لیے کشتی کا انتظار مزید دو گھنٹے۔ پانچ گھنٹے کی اس تفریح کا سن کر ہمارے ارادے ڈھے گئے۔ ہم نے بچوں کو سمجھایا اور لبرٹی لیڈی کو دور ہی سے سلام کر کے چل دیئے۔ شکر ہے بچے سمجھ گئے اور ہمیں تنگ نہیں کیا۔

مین ہٹن کے اندر سب سے آسان سفر کا طریقہ زمین دوز سب وے ٹرین ہے جو انتہائی پھرتی سے ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ حکم کی باندی بن کر آپ کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور آپ کو لے کر پلک جھپکتے میں منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ سب وے سٹیشن کی دنیا بھی اپنی طرز کی ایک الگ دنیا ہے۔ میں نے غور کیا کہ ستر کی دہائی کی نسبت اب یعنی اسّی کی دہائی میں سب وے سٹیشن کافی گندے نظر آ رہے تھے۔ کئی جگہ سے تو اپنے پاک وطن کی طرح پیشاب کی بو بھی آ رہی تھی۔ کوئی کوئی سٹیشن اتنا پر رونق کہ کھوے سے کھوا چھلتا نظر آتا اور کسی پہ اتنی پراسرار خاموشی کہ جھیل سیف الملوک کا سکوت یاد آ جائے۔ اکثر مسافر ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے کتاب یا اخبار پڑھتے نظر آتے ہیں البتہ کچھ اکتائے ہوئے چہرے ٹرین کے انتظار میں اندھیری گھپ پٹریوں کی طرف گھورے چلے جاتے ہیں۔ کچھ موسیقار' گلوکار' فنکار' پلیٹ فارم پہ اپنا ایکوپمنٹ سجائے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں اور کچھ منچلے جن

میں اکثریت کالوں کی ہوتی ہے موسیقی کی لہروں کے ساتھ ساتھ تھرکنا شروع ہو جاتے ہیں۔ لوگ دلچسپی سے اردگرد کھڑے ہونے لگتے ہیں اور موسیقی بجانے والوں کے سامنے بچھے ہوئے کپڑے پہ سکے اور نوٹ پھینک کر آگے گزر جاتے ہیں۔

سب وے ٹرین سٹیشن کے پلیٹ فارم پہ ایک بالکل ہی متضاد قسم کا منظر بھی دکھائی دیتا جسے نظر انداز کرنا قریباً ناممکن تھا۔ میز کرسی ڈالے کوئی نہ کوئی بلیک مسلم مرد یا عورت سر ڈھانپے قرآن پاک اور دیگر اسلامی کتب کا مطالعہ کرتے نظر آتے اور ان کی میز پہ رحل، خوشبویات، اسلامی لٹریچر، تسبیح وغیرہ سجی ہوتیں۔ اگر بتی کا میٹھا میٹھا دھواں دھیمے دھیمے ماحول میں رچ بس رہا ہوتا۔

اسلام کالے امریکنوں میں چالیس کے عشرے میں ایک شخص علی جاہ محمد نے پھیلانا شروع کیا اور کالے تیزی سے مسلمان بننے لگے جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام نے انہیں وہائٹ امریکہ میں اپنا ایک تشخص دیا اور تعصب سے آزادی دلائی، دوسرے یہ کہ کالوں نے اسے اپنا اوریجنل مذہب سمجھ کر اس سے قدرتی لگاؤ محسوس کیا۔ ماضی میں جب افریقہ سے غلام لائے گئے تو پانچ میں سے ایک افریقی مسلمان ہوا کرتا تھا۔ عظیم باکسر محمد علی کے قبولِ اسلام کے بعد امریکہ میں اسلام کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا اور اب امریکہ میں بہت سی اسلامی تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔

سیونٹیز کے جنسی انقلاب کے زمانے کے بعد دنیا کو خصوصاً مغربی ممالک کو بالآخر احساس ہو ہی گیا کہ مادر پدر جنسی آزادی کا نتیجہ ایڈز اور دوسری خوفناک بیماریوں کی صورت میں انھیں مل رہا ہے۔ Eightees میں لوگوں میں اس کے بارے میں کافی شعور اور آگہی پیدا ہو چکی تھی اس لیے جگہ جگہ ایڈز سے متعلق لٹریچر تقسیم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ احتیاط اور حد بندی کی تلقین کی جا رہی تھی۔

یہ بات بھی کچھ کم قابل غور نہیں کہ ایڈز اور دوسری جنسی بیماریاں اسلامی ممالک میں

سب سے کم ہیں جس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اسلام انتہا پسندی کو پسند نہیں کرتا اور نارمل طور یقے سے چلنے کی ہدایت دیتا ہے۔اس کی ممانعتوں کے فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے۔

رات زیادہ ہو جاتی تو ہم اپنے بچوں کو ہوٹل میں سوتا چھوڑ کر فارٹی سیکنڈ سٹریٹ کی سیر کو نکل جاتے کیونکہ فارٹی سیکنڈ سٹریٹ وہ جگمگ گلی تھی جہاں زندگی چلتی نہیں بلکہ ناچتی، روشنیوں کے سیلاب میں بہتی چلی جاتی تھی۔جس طرح کالج کے زمانے میں جب آتش جوان تھی، ہم اپنی سہیلیوں کے ہمراہ انارکلی بازار سے گزرتے ہوئے زیرلب یہ ورد کرتے چلتے تھے کہ ''چٹکیوں سے بچو، کہنیوں سے بچو۔'' اسی طرح فارٹی سیکنڈ سٹریٹ سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کے کان میں کھسر پھسر کر رہے تھے کہ ''شرابی سے بچو، نشئی سے بچو، کالے سے بچو، گورے سے بچو'' ہر قوم اور ملک کے لوگ سائڈ واک پہ آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔کوئی آپ کو الیکٹرانک چیزیں بیچنے کی کوشش کر رہا تھا تو کوئی مخمور سگریٹ...... آپ کی ناک کے آگے لہرا کر آپ کا ایمان متزلزل ہوتے سمجھ کر خوش ہو رہا تھا۔خوبصورت جوان جسموں والی خواتین مختصر تو بہ شکن لباس پہنے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں اور ان کے کارندے کاروں کے اندر جھانک جھانک کر اور راہ چلتے مردوں کے کندھے تھپتھپا کر اپنی آنے والی رات کی روٹی کا بندوبست کر رہے تھے۔کئی چینی مصور سائڈ واک پہ بیٹھے تصویر کشی میں مصروف تھے اور ان کے ساتھ ہی کچھ شطرنج باز اپنی بساط بچھائے اپنے کھیل میں مگن نظر آ رہے تھے۔ان کا انہماک دیکھ کر مجھے اپنے ابا احمد بشیر اور ان کے دوست معروف مصنف صفدر میر مرحوم شدت سے یاد آئے۔وہ بھی ہر شام شطرنج کھیلتے ہوئے اپنے گرد و پیش سے مکمل طور پہ بے نیاز ہو جاتے تھے۔کئی بار جب وہ دونوں اپنی خود ساختہ زبان بولنے لگ جاتے تو ہم بچے کونوں کھدروں میں چھپ کر سنتے اور کھی کھی کرنے لگ جاتے مگر انھیں پتہ بھی

نہ چلتا اور دونوں محو رہتے۔

اب انکل صفدر کسی اور ہی دنیا میں جا بسے ہیں۔ پتہ نہیں وہاں وہ اب کس سے شطرنج کھیلتے ہوں گے؟

غالباً ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے۔ بھٹو صاحب کے دور حکومت میں انکل صفدر میر ایک صحافتی گروپ کے ساتھ نیو یارک آئے اور معروف پروقار ہوٹل والڈورف اسٹوریا میں ٹھہرے۔ ابا نے پاکستان سے حکم صادر کیا کہ تم نے انکل کو فون کرنا ہے اور ہو سکے تو ملنے بھی جانا ہے۔ میں نے حکم کی تعمیل میں والڈورف کا نمبر گھما دیا اور آپریٹر سے مسٹر صفدر میر سے بات کروانے کو کہا۔ چند ہی لمحوں بعد کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے بے ساختہ ''ہیلو انکل صفدر میں نیلم بول رہی ہوں'' کہہ کر گفتگو کا آغاز کر دیا۔ فون اٹھانے والے نے بڑی ملائمت سے جواب دیا ''میں صفدر میر نہیں ہوں، یہ ان کا نمبر نہیں ہے۔ وہ کسی دوسرے کمرے میں ہیں۔''

''اچھا! تو آپ کون ہیں؟'' میں نے بے تکلفی سے پوچھ لیا۔

"I am Bhutto from Pakistan" بولنے والے نے جواب دیا اور بس میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ''ہائے اللہ بھٹو صاحب۔''

''اوہ مائی گاڈ...... آئی ایم سوری ٹو ڈسٹرب یو سر!'' اچانک بادشاہ سلامت سے بات ہو جائے تو گفتگو کرنے کا سلیقہ بھلا کیسے آ سکتا ہے۔ میں اول فول بکنے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات کروں۔

''کوئی بات نہیں آپ آپریٹر سے کہہ کر دوبارہ نمبر ملوا لیں۔''

بادشاہ نے تحمل سے جواب دیا اور میں نے گھبرا کر فون نیچے رکھ دیا۔ مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی میں نے ابھی ابھی اپنے آئیڈیل قومی لیڈر بھٹو صاحب سے بات کی تھی، اتنی بڑی خوش قسمتی میرے حصے میں کیسے آ گئی؟ اس زمانے

میں بہت سارے لوگوں کی طرح بھٹو میرا بھی محبوب قائدعوام' قوم کے خوابوں کا شہزادہ' نجات دہندہ تھا جس سے ہم سب نے بہتری کی امیدیں اور توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ مگر پھر جب بھٹو بھی ہماری قوم کو اندھیروں سے نکالنے میں ناکام ہو گیا تو ہم سب اداس ہو گئے اور اندھیرے مزید گہرے ہو گئے۔ بھٹو صاحب سے ہمکلام ہونے کے واقعے پہ میں کتنے دن کھلی کھلی رہی۔ آج بھی وہ میٹھی یاد ذہن کے بند دریچوں پہ دستک دیتی ہے تو روئیں روئیں میں خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ بھٹو کا کرزمہ ایسا ہی تھا۔ آخر وہ کوئی معمولی لیڈر تو نہیں تھا۔ اس جیسی مقناطیسی شخصیت تو کبھی کسی کی نہیں ہوئی۔

براڈ وے اور فارٹی سیکنڈ سٹریٹ پہ بہت سی کالی کالی لمبوتری لموزین کاریں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ اِن کو امراء' رؤسا اور شوبز کے لوگ سفر کے لیے استعمال کرتے ہیں کیونکہ شیشے کالے ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی باہر سے دیکھ نہیں سکتا' اسی لیے انھیں پرائیویسی مل جاتی ہے۔ ویسے تو امریکہ میں کبھی کسی کے ہاں ڈرائیور' شوفر نام کی کوئی مخلوق نہیں پائی جاتی مگر ان لموزین کاروں کے شوفر بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے ان لموزین کاروں کی بڑی شو اور اہمیت ہوتی ہے اور سب انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں کہ اِن میں بیٹھنا کہاں نصیب ہوتا ہے۔

میں نے بھی ایک لموزین کا دروازہ کھلا دیکھ کر للچائی ہوئی متجسس نظروں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ منا سا کلر ٹی وی چل رہا تھا' بار پہ ڈرنکس سجے تھے' بیٹھنے کے لیے نرم وگداز نشستیں' ہلکی پھلکی موسیقی' خوابناک ماحول' لگتا تھا ظالموں نے پوری زندگی گزارنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ میرا اشتیاق دیکھ کر لموزین کے ڈرائیور کا دل پسیج گیا۔ شاید وہ بھی اپنی سواریوں کے تھیٹر سے نکلنے کا انتظار کرتے کرتے بور ہو چلا تھا۔ ''اگر آپ چاہیں تو اندر جا کر بیٹھ سکتی ہیں!'' اس نے مسکرا کر مجھے آفر کی۔ میں نے آنکھوں

ہی آنکھوں میں اپنے شوہر جی سے اجازت مانگی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں جو جواب ملا ''وہ یہ تھا آپ کی بے وقوفی پہ مجھے کبھی بھی کوئی شک نہیں رہا۔ مگر کوئی چالاک شخص ہم سے تقریباً ایک سوڈالر کا خرچہ کروانے کا ارادہ کرر ہا ہے اور آپ کو سمجھ ہی نہیں آ رہی۔''

''نو تھینک یو۔'' ایک فرمانبردار بیوی نے عیش و عشرت کے جھولے جھولنے سے یکدم انکار کر دیا۔ ''ڈونٹ وری مس۔ نو چارج!'' میری جھجک دیکھ کر وہ بھانپ گیا۔

''مگر کیوں؟ آپ ہمیں خوامخواہ بھلا کیوں اندر سے نظارہ کرنے کا موقع دے دے رہے ہیں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''کیونکہ میں ایک گڈ نیو یار کر ہوں۔ اس لیے۔'' وہ مسکرائے چلا گیا۔ اور میں اس کی فیاضی پہ حیران سوچ میں پڑ گئی کیونکہ امریکہ میں کوئی چیز فری آف چارج نہیں ملتی۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ یہی اس سوسائٹی کا اصول ہے۔ ماں باپ گھر سے جائیں اور بڑے بچے کو کہہ دیں کہ وہ چھوٹے بچے کا خیال رکھے تو اسے اس کی خدمات کی ادائیگی کرتے ہیں۔ مفت میں باجی چھوٹے کاکے کا گُو مُوت نہیں صاف کرتی۔

میرا بیٹا جب چھوٹا تھا اور مجھے اس کے ساتھ کھیلنے کو کوئی بچہ نہیں ملتا تھا تو میں اپنے ہمسایوں کے بچے کو پچاس سینٹ فی گھنٹہ کے حساب سے منگوالیا کرتی تھی۔ ڈیڑھ دو ڈالر میں میرے بیٹے کو کھیلنے کے لیے ساتھی مل جاتا اور میں خوش ہو جاتی کہ چلو میرا بچہ خوش ہو گیا۔

''لموزین ڈرائیور کی نیک نیتی دیکھ کر میری رگ ایڈونچر پھڑ کنے لگی۔ میں نے شوہر جی سے اصرار کیا کہ پلیز پل دو پل کو اندر بیٹھ لینے میں آخر کیا حرج ہو سکتا ہے؟'' وہ بادلِ نخواستہ مان گئے اور ہم اندر گھس گئے دروازہ بند ہو گیا۔ یکدم مجھے یوں لگا جیسے میں کسی فلم کے سین میں داخل ہو کر اس کا کوئی کردار بن گئی ہوں۔ تھوڑی دیر کو دل لرز سا

گیا۔ یاالٰہی کہیں کسی مصیبت میں ہی نہ پھنس جائیں میں نے دل ہی دل میں دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ تازہ تازہ دیکھی ہوئی فلم ''گاڈ فادر'' کی کہانی ذہن میں گردش کرنے لگی۔ اس میں بھی ایسی ہی گاڑیاں اوران کے باوردی شوفر آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لموزین بھی کہیں کسی اٹالین مافیا والے کی نہ ہو؟ ہمیں بھی کوئی کہیں لے جا کر کاٹ کے نہ پھینک دے اور کل کلاں کو ہمارے ہوٹل کے بستر سے کسی کٹے ہوئے سانڈ یا گائے کا خون آلودسر برآمد ہو گیا تو ہمارے لواحقین کیا سوچیں گے؟ میں نے ''جل تو جلال تو'' پڑھنا شروع کر دیا اور اپنے آپ کو ایسی احمقانہ باتیں سوچنے پر لعن طعن کرنے لگی۔ آخر یہ بھی تو سوچا جا سکتا ہے کہ میں کوئی بہت بڑی ہستی ہوں، جیسے لیڈی ڈیانا کی رشتہ دار، کوئی پھوپھی، خالہ وغیرہ اور لموزین میں آنا جانا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ ہوسکتا تھا کہ میں منڈی سے آلو پیاز خریدنے جانے کے لیے لموزین ہی کا استعمال کرتی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا۔ آخر مجھے بھی تو لموزین میں بیٹھنے کا تھوڑا بہت حق پہنچتا تھا۔

''اچھا لائیں آپ دونوں میاں بیوی کی تصویریں اتارتا ہوں۔'' گڈ نیو یارکر مزید گڈ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہم دونوں پرانے میاں بیوی نے اندر بیٹھ کر نئے میاں بیوی کا سا پوز مارا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے تصویر بنوا لی۔ لموزین والا شاید کسی اہم سواری کا انتظار کرتے کرتے بور ہو چکا تھا اور اس کو ہم سے زیادہ دلچسپ لوگ اس وقت کوئی نہ لگ رہے تھے۔ اس لیے اس نے ہم سے نہ کوئی پیسہ لیا اور نہ ہی کوئی گولی ہمارے سینے میں اتاری۔ ہم صحیح سلامت لموزین سے نکل آئے۔ رب کا شکر ادا کیا اور اس کا بھی۔

اس رات میری رگِ ایڈونچر کا پھڑکنا کسی طریقے سے قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ رونقوں کے چوک ''ٹائمز سکوائیر'' میں خوبصورت پھولوں سے سجی بگھی چلتے دیکھ کر اس میں بیٹھنے کو جی مچل مچل اٹھا۔ دو سفید تنومند گھوڑوں اور گھنٹیوں کی آواز والی ہارس کیرج

میں بیٹھی ہر لڑکی سنڈریلا دکھائی دے رہی تھی۔ میرا بھی شاید سنڈریلا بننے کا پہلا اور آخری موقعہ یہی تھا اور میں کسی قیمت پر یہ موقعہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے حوصلہ کر کے ہارس کیرج والے خوش مزاج کوچوان سے سواری کا ریٹ پوچھ ہی لیا۔

''بیس ڈالر فی گھنٹہ۔'' اس نے اپنی لمبی کالی ٹوپی سر سے ہٹا کر مہذب انداز میں جواب دیا۔

کیا کہا؟ بیس ڈالر!'' شوہر جی نے مجھے کچا چبا ڈالنے والی نظروں سے گھورا۔ کیا آپ کو کبھی بچپن میں تانگے میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا؟ تانگہ امریکہ آ گیا تو اس کی قدر و منزلت بڑھ گئی؟ یہ گھوڑے نہ تو انگریزی بول سکتے ہیں اور نہ ہی آپ کو بادلوں کے اس پار لے جا سکتے ہیں جہاں جانے کی آپ کو حسرت ہے۔'' شوہر جی نے یکدم آسمان سے زمین پہ لا بٹھایا۔ میں نے بادلوں کے پیچھے سے جھانکنے والے شہزادے کو بے دلی سے گڈ بائی کہا اور سنڈریلا کی بگھی کو دھیرے دھیرے دور سرکتا دیکھنے لگی۔

ٹائمز سکوائیر میں کئی لوگ مشہور شخصیات کے آدم سائز کٹ آؤٹس کے ساتھ تصویریں کھنچواتے نظر آ رہے تھے۔ کسی کے پہلو میں لیڈی ڈیانا تھی تو کوئی مائیکل جیکسن کے کاندھے پہ سر ٹکائے کھڑا تھا۔ نیویارک سٹی کے گھڑسوار پولیس مین بھی قریب ہی موجود تھے۔ لڑکیاں بالیاں ان کے گھوڑوں کو پیار سے تھپتھپاتیں، ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کھلکھلا کر تصویریں کھنچوانے کی خواہش کا اظہار کرتیں تو پولیس مین بھی چھاتی چوڑی کر کے مسکرا دیتے۔ نیلی وردی میں ملبوس چاق چوبند، سر پہ ہلمٹ پہنے عوام کے خادم ہاتھ میں چھڑی گھماتے واقعی بڑے ہینڈسم دکھائی دے رہے تھے۔ بے چاری لڑکیوں کا آخر کیا قصور؟ مجھے اپنے غریب ملک کے گرمی سے بدحال، کم تنخواہ پانے والے، غنڈ گانہ ذہنیت رکھنے والے پولیس مین یاد آنے لگے جو معاملات کو سلجھانے کے بجائے اکثر زیادہ الجھا دیتے ہیں۔ جن سے سابقہ پڑ جائے تو لینے کے

دینے پڑ جاتے ہیں۔
خیال آیا اگر ہماری پاکستانی دوشیزائیں بھی امریکی لڑکیوں کی طرح کبھی کبھار ان سے ہنس کر بات کرلیا کریں تو کوئی عجب نہیں کہ وہ بھی عوام سے خوش خلقی سے پیش آنا شروع کردیں اور معاشرے میں سکھ پھیل جائے۔ مگر پاکستانی لڑکیوں کو معاشرے کی فلاح کے لیے یوں سر پہ کفن باندھنے کو کیسے کہا جا سکتا ہے۔ آخر وہ بے چاریاں بھی انسان ہیں۔ ایک بار پھر......ان کا آخر کیا قصور؟
ٹائمنر سکوائیر میں بیچ کی گول سی بلڈنگ پہ مسلسل خبروں کی پٹی یعنی Zipper چل رہی تھی جس پہ دنیا بھر کی تازہ خبریں جگمگاتے حروف میں لکھی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس پر جو سرسری سی نظر ڈالی تو وہیں منجمد ہو گئی۔ ایک خبر پاکستان کے بارے میں تھی جبکہ پاکستان کی خبر امریکہ میں شاذ و نادر ہی ملتی تھی۔ مجھے اکثر پاکستان کی خبریں پڑھنے کے لیے کسی لائبریری جا کر اخبارات کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ اولمپک گیمز کے زمانے میں پاکستان کے کھیلوں کی خبر پانا بھی ایک مشکل مرحلہ بن جایا کرتا تھا کیونکہ پاکستان جیسے چھوٹے اور غیر اہم ملک کی خبریں امریکی میڈیا کم ہی دیا کرتا تھا۔ یہ خبر کچھ یوں تھی ''پاکستان میں اوجھڑی کیمپ دھماکا ہوا اور ہزاروں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔'' یااللہ خیر میرا دل ڈر گیا۔ یقیناً یہ کوئی معمولی خبر نہیں تھی ورنہ اس طرح سے ٹائمنر سکوائیر میں نہ دکھائی جاتی۔ میں نے پاکستان کی خیریت کے لیے دعائیں مانگنی شروع کردیں۔ وہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اوجھڑی کیمپ کا حادثہ کتنا بڑا قومی المیہ تھا اور کتنے لوگوں کے گھروں میں قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔
پاکستان کے بارے میں امریکہ میڈیا کی بے حسی کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار جب میں گھر والوں سے ملنے کے لیے پاکستان گئی تو ہوائی اڈے سے گھر جاتے ہوئے سڑک کو سجی بنی دیکھ کر پوچھ بیٹھی ''کیا کوئی غیر ملکی سربراہ آ رہا ہے

جو اتنے جھنڈے، بینر، پوسٹر وغیرہ لگے ہوئے ہیں اور سڑک صاف کی جارہی ہے۔''
بھائی نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کسی غار میں زندگی گزار کے آئی ہوں۔
''کیا بے نیازی ہے آپ کی طبیعت میں!'' چھوٹی بہن نے ہولے سے طنز کیا۔ ''یعنی ہمارے ملک کے سربراہ جنرل ضیاء الحق آپ کے ملک امریکہ سے اتنا کامیاب دورہ کر کے لوٹ رہے ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں یہاں کس کا استقبال ہو رہا ہے؟''
''اچھا؟ ضیاء الحق امریکہ گیا تھا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''کس دنیا میں رہتی ہیں آپ؟ یعنی آپ کو کچھ خبر ہی نہیں۔''
''بھئی میں اخبار پڑھتی ہوں، ٹی وی بھی دیکھتی ہوں، میں نے تو کہیں یہ خبر نہ دیکھی نہ سنی۔''
''میں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی کیونکہ میں سچی تھی۔ امریکی میڈیا نے اتنے اہم آدمی سے ملاقات کے بڑے تاریخی واقعے کو کوریج ہی نہیں دی تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا ضیاء الحق صاحب امریکہ سے ہو کر گئے ہیں۔
بچوں کے ساتھ اپنے پرانے شہر کی سیر کرتے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بھی نیویارک کو بقائم ہوش وحواس پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ میری حیرانیاں خود مجھے حیران کر رہی تھیں۔ ایک نئی نویلی دلہن، ایک شرمائی گھبرائی لڑکی بار بار مجھ سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتی مگر پھر بھیڑ میں گم ہو جاتی، میری نگاہیں اسے ڈھونڈنے لگتیں تو وہ اچانک مجھے اپنی انگلی پکڑے محسوس ہوتی اور ہم پھر سے قدم ملا کر چلنے لگ جاتے۔
میوزیم آف نیچرل ہسٹری، ورلڈ ٹریڈ سنٹر، راکی فیلر سینٹر دیکھ لینے کے بعد مجھے سنٹرل پارک میں سالانہ سمر تھیٹر کے پروگرام ''شیکسپیئر ان دا پارک'' نے اپنا دیوانہ بنا لیا۔ اس خاصے کی چیز کو بڑے بڑے ادارے گرانٹ دے کر ممکن بناتے ہیں اور

نیو یارک کے باذوق لوگ اس فری تھیٹر کے لیے اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں۔ گھاس پہ بیٹھتے ہیں اور شیکسپیئر کے خوبصورت ڈرامے دیکھتے ہیں جو ہر تھیٹر اور ادب کے قاری کے لیے روح کی تسکین کا باعث ہوتے ہیں۔ شیکسپیئر جس کا فن لازوال ہے' ہمیشہ تازہ رہتا ہے یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے' یہی اسے امر بناتا ہے۔

یو این او کی بلڈنگ پہ اس روز دنیا کے ممالک کے مختلف قسم کے جھنڈے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے گائیڈ سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ یہ جھنڈے صرف خاص دنوں میں ہی لہرائے جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میں نے ۱۹۷۳ء میں پہلی بار یو این او کی بلڈنگ دیکھی تھی۔ اس زمانے میں پاکستانی جنگی قیدیوں کی بیویوں کا ایک جتھہ ان کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہا تھا۔ ہم اور انڈیا تازہ تازہ جنگ کر کے ہٹے تھے۔ بنگلہ دیش بن چکا تھا اور بہت سارے پاکستانی قیدی انڈیا کی قید میں تھے۔ وقت بھی کیا عجب چیز ہے آج اتنے سارے سال گزر جانے کے بعد بھی انڈیا اور پاکستان کی دشمنی بدستور اسی طرح قائم ہے' حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور جنگ کا خوف ہر وقت سر پہ منڈلاتا رہتا ہے۔

نیو یارک سٹی کی سائڈ واک کبھی خالی نہیں ہوتیں۔ ان پہ چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں والے سٹریٹ vendors وینڈرز اپنا سودا بیچتے ہیں اور شہری اس قسم کی شاپنگ سے بڑا محظوظ ہوتے ہیں۔ انہی سوداگروں میں مجھے کئی انڈین پاکستانی بھی نظر آئے جو روزگار کمانے کی خاطر چھوٹی چھوٹی سٹال نما دکانوں میں عینکیں' جیولری' کارڈز' سٹکرز' ٹی شرٹس وغیرہ بیچ رہے تھے۔ امریکہ میں بکنے والی ٹی شرٹس اکثر دو قسموں کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو امریکہ کی فیکٹریوں میں بنی ہوتی ہیں اور دوسری وہ جو پاکستان سے امپورٹ کی جاتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ٹی شرٹ بزنس میں پاکستان نے امریکہ میں بہت مقام بنایا یا پھیلایا ہے۔ امریکی ٹی شرٹ تقریباً پندرہ ڈالر کی ہوتی ہے۔ آپ

اسے جیسے مرضی پہنیں، دھوئیں، استعمال کریں وہ ویسی کی ویسی اور وفادار رہتی ہے مگر پاکستانی ٹی شرٹ ہرجائی طبیعت رکھتی ہے۔ دو تین ڈالر قیمت کا لشکارہ دکھا کر اپنے پیچھے لگا لیتی ہے اور خریدار جب اسے خرید کر گھر لے جاتا ہے تو دھونے کے بعد وہ کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے ایک بچے کے لیے خریدی ہے تو دھلنے کے بعد وہ دو بچوں کو بیک وقت پوری آ سکتی ہے۔ اس کے ایک بازو سے لے کر دوسرے بازو کے درمیان اتنا ہی فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے جتنا امریکہ اور پاکستان کے درمیان ہے۔ کتنی ہی بار میں ٹی شرٹ پہ ''میڈ ان پاکستان'' کا لیبل دیکھ کر جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر اسے بچوں کے لیے خرید لیتی مگر پھر بعد میں اس کا اتنا ڈھیلا انجام دیکھ کر توبہ کر لیتی کہ آئندہ اتنی جذباتی نہیں بنوں گی مگر پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ پاکستان کا نام دیکھتی اور سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ نئے سرے سے ٹی شرٹ خرید لیتی اور بچوں کے مذاق کا نشانہ بنتی۔

میں اور میری بیٹی عنبر ایک جیولری، سوونیئر شاپ پہ رش دیکھ کر رک گئے۔ ڈھیروں جیولری دیکھ کر ہم دونوں عورت ذات نے بھی کچھ کانوں میں پہنا، کچھ گلے سے لگایا اور کچھ یونہی آزمایا۔ میں نے ایک خوبصورت چاندی کا کڑا لیا اور اسے ہاتھ میں پہن لیا مگر آٹھ ڈالر قیمت لکھی دیکھ کر یوں جلدی سے اتار دیا جیسے وہ بجلی کا کڑا ہو۔ لو بھلا یہ انارکلی سے سو روپے میں ملتا ہو گا تو میں یہاں سے اتنا مہنگا کیوں لوں۔'' میں نے اپنی بیٹی سے کہا۔ اور ہم آگے کو چل دیں۔ ابھی چند ہی قدم چلی تھیں کہ پیچھے سے آواز آئی ''سسٹر پلیز ویٹ "sister please wait" ''ہائیں'' ہم دونوں رک گئیں۔ گورا چٹا دکاندار جسے میں کوئی ہسپانوی سمجھ رہی تھی میرے سامنے آ گیا اور مجھے وہ کڑا تھما دیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''افغانی بھائی کی طرف سے آپ کے لیے تحفہ'' اس نے اردو میں کہہ کر مجھے حیران کر دیا۔

''ارے آپ افغانی ہیں؟'' میں حیران اور خوش ہو کر بولی۔ اس زمانے میں افغانی امریکہ میں بھی شاذ ہی نظر آتے تھے۔ بعد میں ان کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہو گیا۔ اس نے پوچھنے پہ بتایا کہ وہ اور اس کی فیملی کچھ سال پاکستان میں رہی ہے۔ اسی لیے اسے اردو بولنا آ گئی ہے۔ چونکہ روسی فوجوں کی وجہ سے افغانستان کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی فیملی نے امریکہ میں سیاسی پناہ لے لی ہے۔ امریکہ افغانیوں کو بڑی آسانی سے ویزا دے رہا تھا اس لیے بہت سے افغانی امریکہ ہجرت کر آئے تھے۔ میں اس کی فراخدلی سے بہت متاثر ہوئی اور اس کے بہت اصرار پر اس سے وہ کڑا تحفتہً لے لیا۔

مذہبی، جغرافیائی، معاشرتی یکسانیت کی وجہ سے مجھے اپنا سمجھنے والا اس وقت واقعی مجھے بھی ایک بھائی کی طرح پیارا لگ رہا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان بس ایک انسانیت اور اپنائیت کا رشتہ ہی تو تھا مگر کتنا مضبوط بن جاتا ہے یہ رشتہ پردیس میں اور کتنی طاقت دیتا ہے آپ کو۔ یہ احساس صرف ایسے خوشبودار لمحوں میں ہی ہوتا ہے جب کوئی آپ کو اپنا سمجھ کر ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔ ایک بار پھر مجھے یقین ہو گیا کہ شہر کی صورت شکل، اس کے نظارے، ڈھنگ بدل سکتے ہیں لیکن انسانی روّیے ویسے کے ویسے رہتے ہیں۔ انسان کی انسان سے محبت اور آپس میں انسیت کے ناتے قائم رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی اجنبی آپ پر محبت کی دیا کر دیتا ہے تو آپ کے اندر ایک چراغ سا روشن ہو جاتا ہے اور آپ روشنی سے بھر جاتے ہیں۔ مشہور امریکی ڈراما نگار Tennessee Williams کی کتاب "A STREETCAR NAMED DESIRE" کے آخری باب میں اس کی ہیروئن سٹیلا کو پاگل خانے لے جانے کے لیے ہاسپٹل سے گاڑی آتی ہے۔ سٹیلا پہلے ہچکچاتی ہے اور پھر ڈاکٹر اور نرس کے ساتھ یہ کہتے ہوئی چلی جاتی ہے کہ ''میں نے ہمیشہ ہی اجنبیوں کی مہربانیوں پہ

اعتماد کیا ہے۔"

میں نے بھی ایک اجنبی ملک میں اتنے سال آسانی سے یوں گزار لیے کہ غیر اپنے بنتے چلے گئے۔ فاصلے گھٹتے چلے گئے اور کاروانِ حیات چلتا رہا۔ آج پاکستان کے ساتھ ساتھ امریکہ بھی مجھے اپنا گھر محسوس ہوتا ہے۔ دونوں معاشروں نے مجھ پہ اپنے اپنے طرز کی رنگین پچکاریاں چھوڑیں اور مجھ میں زندگی کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی صلاحیتیں پیدا کیں۔ پچھلی صدی ختم ہوئی اور ایک نئے زمانے کا آغاز ہوا۔ میری کتاب زندگی کا پرانا باب بھی ختم ہوا' بچے بڑے ہو گئے اور اپنی جنم بھومی امریکہ میں ہی رہ گئے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے نصیب کا سکھ کھوجنا اور منزل کی تلاش کرنا ہوتی ہے اس لیے میں نے بھی بچوں کو ان کے حصے کے آسمان میں پرواز کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ سال میں ایک بار ان کی محبت کی مہک سونگھنے خود ان سے ملنے امریکہ چلی جاتی ہوں اور پھر پاکستان کی مٹی چومنے کو لوٹ آتی ہوں۔ امریکہ اور پاکستان دونوں مجھے عزیز ہیں۔ دونوں مجھے میرے اپنے ملک لگتے ہیں۔

☆☆

وقت کی بساط پہ زندگی مجھے شطرنج کے ایک مہرے کی طرح برتتی رہی۔ کبھی میں سفید خانے میں ہوتی اور کبھی مجھے اٹھا کر سیاہ خانے میں رکھ دیا جاتا اور یوں کھیل جاری رہتا۔ میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان گھمن گھیریاں کھاتی رہی۔ میرے بچے اب میری شاخوں پہ کھلنے والے ننھے ننھے پھولوں کی جگہ تناور درخت بن چکے ہیں اور ان کی زندگیاں امریکہ کی سرزمین میں مضبوطی سے جڑ پکڑ چکی ہیں۔ میرا وقت آدھا امریکہ اور آدھا پاکستان میں گزرتا ہے، مہرہ پٹنے سے بچنے کے لیے جگہیں بدلتا رہتا ہے۔ کبھی روپوش اور کبھی نمودار ہو جاتا ہے۔

سال ۲۰۰۱ء دنیا بھر کے لیے ایک اہم سال تھا۔ اس سال بھی معمول کے مطابق میں موسم گرما گزارنے اپنے بچوں کے پاس امریکہ گئی ہوئی تھی۔ میری بیٹی عنبر نیویارک کے پرسکون رہائشی علاقے کوئینز Queens میں مقیم تھی اور بیٹے کاشف نے نیویارک کے نواحی شہر سٹیٹن آئی لینڈ STATEN ISLAND میں اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔ چھوٹی بیٹی سمیرا نیویارک سٹیٹ کے بالائی حصے میں، برف پوش خوبصورت پہاڑوں میں گھرے شہر بفلو Buffalo میں زیر تعلیم تھی۔ یونیورسٹی آف بفلو کے ہاسٹل میں اس کے پاس ایک کمرہ تھا جس کی وجہ سے اسے کیمپس آنے جانے میں آسانی رہتی تھی۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ میرے امریکہ پہنچتے ہی سمیرا کی چھٹیاں ہو جاتی ہیں اس لیے وہ بھی مجھے ملنے اپنے بہن بھائی کے گھر نیویارک پہنچ جاتی ہے۔

ویسے تو میرا اور میرے بچوں کا آپس میں ملنا ہی سال کا اہم واقعہ ہوتا ہے لیکن سمر آف ۲۰۰۱ء میرے اور بچوں کے لیے ایک اور لحاظ سے بھی خاصا اہم تھا۔ اس سال میری بہن سنبل پہلی بار امریکہ آ رہی تھی اور یہ ہمارے پورے خاندان کے لیے بڑا

ایکسائیٹنگ واقعہ تھا۔ بچوں کی دوسری خالہ بشریٰ تو اپنے کام کے سلسلے میں امریکہ آتی رہتی ہیں، مگر چونکہ اب کی بار سنبل خالہ سے ملاقات ہونا تھی اس لیے سب لوگ ان کے آنے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ امریکہ میں فیملی ری یونین کرنے کا یہ ایک انوکھا موقع تھا جس کی ہمیں بہت خوشی ہو رہی تھی۔

سنبل گیارہ اگست ۲۰۰۱ء کو نیویارک کے جان ایف کینیڈی ائیر پورٹ پر اتری تو ہم اسے لے کر میرے بیٹے کاشف کے ٹاؤن سٹیٹن آئی لینڈ کو چل دیے کیونکہ اسے میرے ساتھ وہیں ٹھہرنا تھا۔ سٹیٹن آئی لینڈ بڑا پیارا شہر ہے۔ نیلے پانیوں والے ہڈسن دریا hudson River کے دوسرے کنارے بسنے والا یہ خوبصورت قدیم شہر تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے اور نیویارک کے بیچ بہنے والے ہڈسن کی گہرائیوں میں چھ سوفٹ نیچے ایک ایسا مقام آتا ہے جسے Camerons line یعنی کیمران کی لکیر کہا جاتا ہے۔ کیمران نامی کسی سائنسدان نے ٹھوس ثبوت مہیا کرنے کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہی وہ لکیر ہے جہاں تین سو بیس ملین سال قبل شمالی امریکہ اور افریقہ کی Continental plate کا آپس میں ٹکراؤ ہوا تھا۔ یعنی یہیں پہ گھر میں برتن ٹوٹے اور علیحدگی ہو گئی تھی۔ پھر دونوں براعظم دور دور سرک گئے۔ آج دنیا کی موجودہ جغرافیائی اور معاشرتی صورت حال دیکھ کر یہ یقین کرنا بہت مشکل لگتا ہے کہ امریکہ کبھی کسی دوسرے براعظم سے اتنا قریب بھی تھا۔ یعنی اس زمانے میں ویزے بغیر ہی ٹاپ کر امریکہ آیا جا سکتا تھا۔ کتنی عجیب بات لگتی ہے۔

سٹیٹن آئی لینڈ کو اٹھارویں صدی کے آغاز میں جنگل صاف کر کے رہائشی علاقہ بنایا گیا اور ۱۹۴۷ء میں FreshKills کے نام سے یہاں کے مشہور کوڑا قبرستان یعنی Dump کی بنیاد رکھی گئی۔ اس ڈمپ میں نیویارک کا ہر قسم کا کوڑا کرکٹ (کیمیائی فضلے سمیت) پھینکا جانے لگا اور یہ شہر کوڑا گاہ کی وجہ سے بدنام سا ہو گیا۔ اس نیم

دیہات نیم شہر میں زیادہ تر وہی لوگ آباد ہیں جو لوئر مین ہٹن نیویارک میں کام کرتے ہیں۔ اور لوئر مین ہٹن Lower manhattan ڈاؤن ٹاؤن نیویارک کا وہی علاقہ ہے جہاں وال سٹریٹ فنانشل ڈسٹرکٹ اور ورلڈ ٹریڈ سنٹرز کے جڑواں ٹاور ایستادہ ہوا کرتے تھے۔

کاشف بھی اسی لیے وہاں رہتا تھا کیونکہ گزشتہ دو سالوں سے وہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں واقع ایک پبلشنگ ہاؤس میں را کاؤنٹ مینجمنٹ کی جاب کر رہا تھا۔ اس سال عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ جون میں کاشف کی کمپنی نے کاروبار میں نقصان کی وجہ سے اپنا سٹاف کم کرنا شروع کر دیا اور اگست میں کاشف کو بھی فارغ کر دیا گیا جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان اور افسردہ ہوا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ''بیٹا فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ ایک در بند کرتا ہے تو دوسرا کھول دیتا ہے۔ اسے اللہ کی مصلحت سمجھ کر صبر سے قبول کرو۔'' اس وقت نہ میں جانتی تھی نہ وہ کہ اس کام میں اللہ تعالیٰ کی کون کون سی مصلحتیں کارفرما تھیں اور کیا سے کیا ہونے والا تھا۔ تقدیر کی منصوبہ بندی کا کس کو پتہ ہوتا ہے؟ تقریباً ۱۰۸ منزلوں والی مضبوط عمارات کیسے نیست و نابود ہونے والی تھیں۔ کون جانتا تھا؟

ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں واقع پبلشنگ کمپنی Donnelly,s اپنے ملازمین کو اچھی تنخواہ کے ساتھ ساتھ اسی سنٹر کے اچھے اچھے ریستورانوں سے کھانا بھی منگوا کر فری میں دیا کرتی تھی جس سے ورکرز بہت خوش رہتے تھے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹرز کے دونوں ٹاور محض دو عمارتیں نہیں تھیں، امریکی برتری اور ترقی کے نمائندہ نشان تھے جن میں واقع سینکڑوں دفاتر میں ہزاروں اشخاص دن رات کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں تفریحی مراکز، ہوٹل، نائٹ کلب، میوزیم، چرچ، لائبریری، بنکوں کے سیف لاکرز غرضیکہ ایک دنیا آباد تھی، ایک عالم بس رہا تھا۔ ایک ٹاور کی چھت پہ ٹیلی کمیونی کیشن کا بہت بڑا مواصلاتی انٹینا نصب تھا جس کی وجہ سے نیویارک کا دنیا بھر سے رابطہ رہتا تھا۔ اس

چھت پہ کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی مگر ایک میوزک گروپ نے وہاں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے جا کر ویڈیو شوٹنگ کرنے کی اجازت مانگی تو ہزار منتوں کے بعد انہیں اس کی اجازت مل گئی۔ وہ پھولے نہ سمائے اور اس طرح حیرت انگیز طور پہ دنیا کی سب سے اونچی چھت کا ایک ویڈیو ہمیشہ کے لیے تیار ہو گیا اور تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔

گو کاشف کی جاب چھوٹ چکی تھی مگر پھر بھی ہمیں تسلی تھی کہ اس کا گزر آسانی سے ہو جائے گا کیونکہ امریکی حکومت اتنا بیروزگاری الاؤنس ضرور دیتی ہے جس سے زندگی کا سلسلہ چلتا رہے۔ ہمارے ملک کی طرح امریکہ میں لوگوں کو فاقہ کشی کی وجہ سے پنکھوں سے لٹک کر خودکشی نہیں کرنا پڑتی۔ حکومت عوام کی مدد کرتی ہے اسی لیے یہ وطن کامیاب ملک ٹھہرتے ہیں۔ ہمارے منتخب حکمران امپورٹڈ منرل واٹر کے گھونٹ پی کر پوری قوم کا گھونٹ بھر جاتے ہیں اور ہم بے بسی سے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتے۔

کاشف اکثر مجھے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے بارے میں بتاتا اور اس کے قصے کہانیاں سناتا رہتا۔ کئی بار صبح کی شفٹ میں وہ ناشتہ ٹاپ فلور پہ واقع ریسٹوران 'ونڈوز آف دی ورلڈ Windows of the world' میں ہی کیا کرتا۔

ایک بار وہ مجھے بھی لنچ کے لیے وہاں لے گیا تو میں اس خوبصورت چوکور شیش محل کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ دنیا کے سب سے اونچے ریسٹوران کی دیواریں زمین سے لے کر چھت تک تمام کی تمام شیشے کی بنی ہوئی تھیں۔ بادلوں میں گم اونچائیوں والے اس شیش محل کے خوابناک ماحول میں دنیا بھر کے معززین، بزنس مین، مہذب اقوام سے تعلق رکھنے والے خوش پوش لوگ جنہیں پسماندہ اقوام اور کم تر عوام سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا بڑے بڑے معاہدے کرتے، ہنستے مسکراتے، کھاتے پیتے نظر آ رہے تھے۔ شیشے کی دیواریں آسمان کو لپکتے ہوئے سفید سفید بادلوں کے راستے میں سینہ

تا نے کھڑی تھیں اور بے تاب بادل ان سے لپٹ لپٹ کر اندر بیٹھے لوگوں کو دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر تاک جھانک کر رہے تھے۔ ایک عظیم بادشاہ ملک کے اہم ترین پہاڑوں میں ایک خاص پہاڑ کی اونچی چوٹی پہ بیٹھے لوگ مہمان تھے کیونکہ ان کا تعلق بادشاہ ملک سے تھا اور اسی لیے بادل ان کا سواگت کرنے کو جھکے جھکے جا رہے تھے۔

سٹیٹن آئی لینڈ میں رہنے والے لوگ کاشف کی طرح صبح گھر سے نیویارک جاتے اور شام کو لوٹ آتے چونکہ انہیں مین ہٹن یعنی دریا کے اس پار جانا ہوتا۔ نیویارک شہر کی ٹرانزٹ اتھارٹی نے ان کی سہولت کے لیے بڑی بڑی پیلے رنگ کی Ferries (کشتیاں) چلانے کا بندوبست کر رکھا ہے جو آدھے گھنٹے کے وقفے سے چلتی رہتی ہیں۔ یہ فیریز روزانہ پریوں کی سی برق رفتاری کے ساتھ تقریباً ستر ہزار لوگوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر دریا پار اتار دیتی ہیں۔ نیویارک چونکہ ٹورسٹوں کا محبوب شہر ہے اس لیے فیری ٹورسٹوں سے بھری نظر آتی ہے جو نیویارک کے نظارہ ہائے دلنشیں سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے ہر وقت کیمرے تھامے بیگ کندھوں سے لٹکائے، جوگرز پہنے ادھر سے ادھر گھومتے نظر آتے ہیں۔ اکثر ٹورسٹ نیویارک کی جگمگاتی موتیوں کی لڑی جیسی مسحور کن سکائی لائن کی تصویریں کھینچنے کے لیے بلند و بالا عمارتوں کی طرف چہرے اونچے کیے تکتے نظر آتے ہیں۔

فیری پانی سے گزر رہی ہو تو بروکلین برج، ویرازانو برج'' مجسمہ آزادی اور Ellis Island کا تاریخی سی پورٹ بالکل قریب سے دکھائی دیتا ہے اور جب وہ نیویارک سٹی کے ساحل کو چھونے لگتی ہے تو ایک الف لیلوی شہر کے دروازے وا ہونے لگتے ہیں اور اس کے خوبصورت طلسم سے آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں۔ مین ہٹن آپ کے استقبال کے لیے اپنی پوری شان اور وقار کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ چلنے سے پہلے فیری ایک زور کا بھونپو بجاتی ہے جسے سنتے ہی لوگ دیوانہ وار اس کی جانب دوڑنے

لگ جاتے ہیں کیونکہ اگر فیری چھوٹ جائے تو اگلی فیری کے لیے آدھ گھنٹہ مزید انتظار کرنا پڑتا ہے۔ خود ہم نے بھی کئی بار ٹرمنل سے تھوڑا سا دور ہونے کے باعث بھونپو سنتے ہی بے تحاشا دوڑیں لگائی ہیں اور ہانپتے کانپتے سانس پھلاتے' فیری کا گیٹ بند ہونے سے پہلے کود کر اندر چھلانگیں لگا کر گھسنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

فیری کے اندر ایک انوکھی دنیا دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہر طرح اور ہر رنگ ونسل کے مسافروں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ کوئی اخبار' یا کتاب پڑھتا' تو کوئی تصویریں کھینچتا نظر آتا ہے۔ کئی شوقیہ فنکار اتنی خوبصورت گلوکاری کرتے ہیں کہ طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے۔ اپنا آدھ گھنٹہ محظوظ ہو کر گزرنے پر کئی مسافر ایسے فنکاروں کو پیسے دے کر خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور پھر اتر جاتے ہیں۔

سفر کے دوران کئی بار مسافروں پہ عجیب وغریب کیفیات طاری ہوتی نظر آتی ہیں۔ نیلے گہرے پانی میں جھاگ اڑاتی بڑی سی پیلی کشتی ہوا کے خوشگوار مہکتے جھونکے' سر پہ نیلے آسمان کا وسیع پھیلاؤ' ایک دھیرے دھیرے دور ہوتا اور ایک قریب آتا نظر آتا زندگی سے بھرپور شہر۔ کرسٹوفر کراس کے پرانے نغمے کی بازگشت کانوں میں گونج کر بیتے وقتوں کی یاد پھر سے دلا جاتی ہے جو اس نے نیویارک کے اوپر منڈلاتے جہاز میں پھنس کر لکھا تھا۔ ''جب آپ چاند اور نیویارک کے درمیان گم ہو جائیں تو''...... لیکن جب آپ فیری پہ سوار ہو کر نیویارک کی جانب بڑھتے چلے جائیں تو بھی یہی نغمہ یاد آتا ہے۔

Best that you can do is-- fall in love.

فیری میں سوار ہو کر واقعی انسان کا یہی جی چاہتا ہے کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو جائے اور وہ جب ڈوبے کنارے اترے تو اسے کوئی اس کا انتظار کرتا ہوا ملے۔ کئی نوجوان اور جوانی کی حدود کو پھلانگ جانے والے جوڑے بھی اس رومانی سفر میں ایک

دوسرے سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے سفید سفید بگلوں کو دور تک اپنے ساتھ اڑتا دیکھ کر میٹھی میٹھی نظروں سے مسکراتے ہیں اور ہم جیسے ندیدوں کو ترساتے ہیں۔ایک بوڑھا جوتے پالش کرنے والا شوشائن، شوشائن کی آوازیں لگاتا مسافروں کو اپنی خدمات پیش کرتا ہے اور کوئی تنہا مسافر دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں گم چپ چاپ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا ہے۔بال بچے دار شرفاء ٹورسٹ اپنے بچوں کو گود میں اٹھا کر ویرازانو برج اور سٹیچو آف لبرٹی دکھا دکھا کر خوش ہوتے ہیں مگر ان کے ضدی بچے چند ہی منٹوں میں اکتا کر ان سے آلو کے چپس اور کوک کی فرمائش کرنے لگ جاتے ہیں۔

سنبل کے پاکستان سے آنے کے بعد اگلے ہی روز بشریٰ کا نیو یارک سے فون آ گیا کہ آ کر مجھے مل جاؤ۔میں آپ سب سے ملنے کو بے تاب ہوں، سو ہم نے اس سے ملنے کی تیاری شروع کر دی۔اگست کا وسط تھا اس لیے موسم ابھی تک کچھ کچھ گرم تھا۔ہم نے شلوار قمیض کے نیچے جوگرز پہنے تو سنبل ہمارا حلیہ دیکھ کر ہنس پڑی۔"بھئی نیو یارک میں پیدل بہت چلنا پڑتا ہے اس لیے جوگرز ہی پہننے پڑتے ہیں۔تم بھی یہ سینڈل اتارو اور آرام دہ جوتے پہن لو" ہم نے اسے مشورہ دیا مگر اس نے ہماری ایک نہ سنی ایسا کرنا فیشن کے خلاف جو تھا۔وہ اپنی ضد پہ قائم رہی اور سینڈل پہن کر ہی سارا نیو یارک گھومی۔

ہم تیار ہو کر بلڈنگ سے نیچے اترے اور سڑک پہ کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگے۔خاموش بت بنے ڈرائیور کے سر پہ لکھی عبارت پڑھ کر میں اور سنبل ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔جلی حروف میں رقم تھا "دورانِ سفر ڈرائیور سے باتیں کر کے اسے ڈسٹرب نہ کیجیے۔"

"بڑے نالائق ہیں یہاں کے ڈرائیور۔" سنبل نے میرے میں سرگوشی کی۔"کیا

ڈرائیونگ کے وقت وہ اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتے؟ ہمارے پاکستانی ڈرائیور تو گاڑی چلاتے ہوئے کبھی مسافروں کے ساتھ گپ شپ کرتے ہیں اور کبھی کنڈکٹر سے لڑائی۔ دوسرے بس ڈرائیوروں سے ریس لگاتے ہیں اور نیند کا جھونکا آجائے تو پل بھر کو اونگھ بھی لیتے ہیں۔''ایفی شینسی بھی آخر کوئی چیز ہے۔''ہم دونوں ہنسنے لگیں۔

برق رفتار بس نے ہمیں فیری کی روانگی سے عین پانچ منٹ پہلے ٹرمینل پہ پہنچا دیا اور ہم دوڑ لگائے بغیر آرام سے فیری میں سوار ہو گئے۔ آدھ گھنٹے کے خوشگوار بحری سفر کے بعد ہم ساؤتھ فیری سب وے ٹرین سٹیشن کے عین نیچے جا پہنچے۔ اس وقت رش کا زور تھا۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین نمبر چار کھچا کھچ بھری ہوئی تھی مگر پھر بھی ہمیں سینگ سمانے کی جگہ مل ہی گئی۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے، سانس بھی مشکل ہی سے آرہا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے ایک نشست حاصل کی اور میں سنبل اور میری بیٹی سُمی بیٹھ گئے۔ زیادہ تر لوگ خاموش کھڑے تھے مگر ایک نوجوان جوڑا دنیا و مافیہا سے بے نیاز سہارے کے لیے لگے ڈنڈے (پول) سے زیادہ ایک دوسرے سے لپٹ جھپٹ رہا تھا۔ بے انتہا خوبصورت لڑکی اور اس کا ساتھی آپس میں حد سے زیادہ مصروف ہو رہے تھے جس سے کسی کو بھی کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی سوائے ایک بابا جی کے جو کچھ چڑ رہے تھے۔ کیونکہ بابا جی نے بھی رش کی وجہ سے اسی پول کا سہارا لے رکھا تھا۔ گاڑی کے چلنے اور رکنے اور لڑکی لڑکے کے گرم جوش اور جذباتی ہچکولوں کی وجہ سے پول ان کے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔ جس کے باعث بابا جی نے دونوں سے کہا۔ "cool it"

یہ سن کر لڑکی نے لڑکے سے جھگڑنا شروع کر دیا کہ ''تم نے مجھے شرمندہ کروا یا دیا۔ تم اپنی حد میں کیوں نہیں رہتے؟'' ان کی آپس کی لڑائی سے ہم بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سنبل چونکہ پہلی بار ایسا دلچسپ منظر دیکھ رہی تھی اس لیے اس نے

کچھ زیادہ ہی دلچسپی سے ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔لڑکی نے غصے سے ہمیں دیکھا اور اپنے دوست سے کہا 'جی چاہتا ہے اس عورت کو کچھ دے ماروں کیونکہ یہ میری طرف گھورے ہی چلی جا رہی ہے۔'' اس امریکی حسینہ کا خیال تھا کہ ان اجڈ شلوار قمیض والی عورتوں کو بھلا انگریزی کہاں آتی ہوگی۔میں نے جلدی سے سنبل کو ٹوکا کہ اس کی طرف نہ دیکھے وہ برا مان رہی ہے۔

''میں تو یہ دیکھ رہی تھی کہ یہ کس قدر خوبصورت لڑکی ہے۔ایسی لڑکیاں ہی تو انگلش فلموں میں ہوتی ہیں۔'' میری بہن نے بھولپن سے جواب دیا اور اپنی تعریفی نگاہیں اس حسینۂ دلنواز کے چہرے سے ہٹا لیں۔میں اسے کیا بتاتی کہ نیویارک کے لوگ بڑے لڑاکے اور بے صبرے ہوتے ہیں۔ایک منٹ میں گندی گالیوں پہ اتر آتے ہیں۔سڑک پہ ٹریفک چل رہی ہو اور اگر ایک گاڑی دوسری کو کراس کر لے تو خون خرابہ تک ہو جاتا ہے۔اس قسم کے جھگڑے کو Road Rage کہا جاتا ہے۔ نیویارک میں تو بس سب کو اپنے کام ہی سے کام رکھنا چاہیے اور بس۔

سب وے ٹرین سے اتر کر ہم میڈیسن ایونیو پہ چلنے لگے۔چند ہی قدم پر ہمیں اپنی منزل میڈیسن ہوٹل نظر آ گیا۔بشریٰ وہیں ٹھہری ہوئی تھی۔یہ ہوٹل ایک پاکستانی وکیل انصاری صاحب کی ملکیت ہے اسی لیے وہاں کافی گھریلو سا ماحول ملتا ہے۔بیشتر پاکستانی فنکار، شاعر، میوزک گروپس والے یہیں ٹھہرنا پسند کرتے ہیں۔سنتے ہیں کہ یہ ہوٹل وکیل صاحب کو ان کے یہودی ایمپلائر نے ان کی کارکردگی سے متاثر ہو کر تحفتاً دے دیا تھا۔نیویارک میں رہنے والے پاکستانیوں کے بارے میں اچھی باتیں سن کر بہت خون بڑھتا ہے۔دو تین برس پہلے ہی ایک پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور نے ایک مسافر کو اس کا ڈالروں سے بھرا ہوا بیگ لوٹایا تھا جو وہ اترتے وقت سیٹ پہ بھول گیا تھا۔اس واقعے کا اخباروں میں، ٹی وی پہ بہت تذکرہ ہوا اور میئر نے اس نوجوان کو شاباش دی۔

پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کی عزت افزائی ہوئی تو ساری کمیونٹی خوش ہوئی۔
بشریٰ کے ساتھ اس کے ڈرامے کے ساتھی فنکار نبیل، لیلیٰ واسطی، آصف رضا میر صاحب بھی اسی ہوٹل میں قیام پذیر تھے جہاں وہ ہم سب کو ملے اور تھوڑی دیر بعد فراغت ملنے پہ ہم بشریٰ کو لے کر نیویارک کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے ہم ٹائمنز اسکوائیرز کے جو نیویارک سٹی کی جان اور پہچان ہے۔ خوبصورت شاہراہوں، جگمگاتے چوک، اشتہاروں کے دیوہیکل بل بورڈ اور دنیا کی ہر قوم کے لوگوں کے آتے جاتے ریلے۔ ٹائمنز اسکوائیر حسب معمول اپنے مزیدار ماحول کی وجہ سے سب کو مسحور کر رہا تھا۔ بڑی سی ٹی وی سکرین پہ امریکہ کے میجر ٹی وی نیٹ ورک اے بی سی کا مسلسل چلنے والا خبرنامہ، ایم ٹی وی سٹوڈیوز کی آؤٹ ڈور پکچرائزیشن کا لائیو ریکارڈنگ شو سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ چاروں طرف زندگی کی رونق تھی، ہنگامہ بپا تھا۔ برسوں پرانی فارٹی سیکنڈ سٹریٹ کا، جہاں مخرب اخلاق، شوز، کلب، جسم فروشی کے اڈے ہوا کرتے تھے، اب دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ ڈزنی کمپنی نے اس سٹریٹ کو خرید کر فیملی فن fun کے لیے ایک دلچسپ سٹریٹ بنا دیا ہے جس پہ اب جا بجا کھلونے، ٹی شرٹس اور دوسرے عام دلچسپی کے آئٹمز کے سٹور ہیں اور فیملی والے بلا جھجک اپنے بال بچوں کو لے کر ان میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ نیویارکرز نے اس کلین اپ کو بہت سراہا اور اس کے لیے اپنے میئر کو بڑھ بڑھ کر خراج تحسین پیش کیا۔
ٹائمنز سکوائیر میں آج بھی چینی مصوّر سائڈ واک پر بیٹھے تصویر کشی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آپ پاس سے گزر جائیں تو آپ کو کھینچ کھینچ کر بٹھانے کی کوشش کریں گے۔ چینی لوگ چونکہ مساج کے بھی ماہر ہیں اس لیے سڑک پہ ہی کرسی ڈال کر لوگوں کی مالشیں کرتے نظر آتے ہیں۔ جب انھوں نے ہمیں بھی پانچ منٹ کے لیے مفت مساج کی ٹرائی دی تو میں اور بشریٰ جو اکثر کمر اور گردن کی درد میں مبتلا رہتی ہیں، مالش

کروانے کے لیے تیار ہو گئے۔ پاکستان میں رنگ برنگی بوتلوں والے مالشئیوں سے مالش کروانا تو کجا ہم بات تک نہیں کرتے مگر آخر یہ امریکہ تھا اور مالشیے چینی۔ ہم نے دس دس ڈالر دے کر پندرہ منٹ کی چینی مساج کروائی، گردنیں دبوائیں تو ہمارے ٹوٹے پھوٹے تھکے ماندے جسموں میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔

ہم کتنی ہی دیر بت کی طرح ساکت کھڑے ہوکر mime کرنیوالوں کو دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے۔ بدن اور چہرے پہ پینٹ کیے ایک ہی پوز میں مستقل کھڑے ہوکر لوگوں کو یوں انٹرٹین کرنے والے شام تک کافی پیسے کما لیتے ہیں۔ کالے امریکی نہ جانے کہاں سے تھوک مال میں ٹی شرٹس، جیولری، بیگ، بیلٹس، متفرق اشیاء لاتے ہیں اور سائڈ واک پہ ٹیبل سجا کر آوازیں لگا لگا کر بیچنے لگ جاتے ہیں۔ تجاوزات چونکہ غیر قانونی ہوتی ہیں اس لیے جونہی انہیں کسی پولیس کار کی خبر ملتی ہے یا چھاپہ پڑنے لگتا ہے، سامان سمیٹ کر کسی دوسری گلی میں جا بیٹھتے ہیں۔ ان کا یہ منظر دیکھ کر ہمیں بے اختیار اپنا پیارا وطن یاد آ گیا جہاں کبھی کبھار حکومتیں یونہی اخلاقاً یا فیشن کے طور پر ناجائز تجاوزات ختم کرنے کا ڈراما رچاتی ہیں۔ کچھ دن چھاپے پڑتے اور سامان اٹھائے جاتے ہیں اور پھر کچھ عرصے بعد جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ چھابڑیوں والے حسب سابق سائڈ واک پہ قبضے جما لیتے ہیں۔ چلو امریکہ میں کوئی بات تو پاکستان جیسی بھی ہوتی ہے یہ سوچ کر کافی خوشی محسوس ہوئی۔

ٹائمز سکوائیر ہی میں ہر نئے سال کی آمد کی خوشی میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور جی بھر کے نیو ائیر نائٹ مناتے ہیں۔ بارہ بجے رات سے کچھ پہلے ایک بہت بڑا شیشوں کا بنا ہوا چمکتا، جھلملاتا، بال دھیرے دھیرے نیچے آنا شروع ہو جاتا ہے اور پورے بارہ بجے نیچے پہنچ جاتا ہے تو لاکھوں کا مجمع ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا ہوتا ہے مگر کوئی غنڈہ گردی نہیں ہوتی۔ کوئی غیر آدمی کسی عورت کو چھیڑنے یا چھونے کی کوشش نہیں کرتا۔ اپنی اپنی عورت کو ہی اپنے گرد لپیٹتے ہیں جبکہ ہمارے پیارے پاکستان میں اگر کوئی عورت کسی مجمع میں چلی جائے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کرے۔

اس بات پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ ہم لوگ ٹائمز سکوائیر میں گھومتے پھرتے یکا یک ایک نظارہ دیکھ کر رک گئے۔ ایک گورا امریکن فقط انڈر ویئر اور لانگ بوٹ پہنے، سر پہ ہیٹ سجائے گٹار بجا رہا تھا اور لوگ اس کے پاس سے مسکرا مسکرا کر اسے ڈالر دیتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مجھے یاد آیا میں نے صبح کی خبروں میں لائیو کوریج کے دوران Naked cowboy کے نام سے اس شخص کو ٹی وی پہ دیکھ رکھا تھا۔ اس کا شمار اب نیویارک کے زندہ دلان میں ہونے لگا تھا۔ اس شخص کے بارے میں ٹی وی پہ یہی بتایا جاتا تھا کہ یہ سردی گرمی اسی لباس میں ہمیشہ اسی سپاٹ پہ کھڑا ہوتا ہے اور اب آہستہ آہستہ ٹائمز سکوائیر کے نظارے کا لازمی جز بنتا جا رہا ہے۔

ایک بوڑھے کالے نے ہمیں بڑے پیار سے ''نمستے'' کہہ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے اسی پیار سے اسے وعلیکم السلام کہہ دیا جسے سن کر وہ مسکرا کر رہ گیا۔ اب تک زیادہ تر

لوگ ہم براؤن لوگوں کو انڈین ہی سمجھتے ہیں حالانکہ ستّر اور اسّی کی دہائی کی نسبت اب پاکستانی لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ اب اگلی نسل پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہے' پھر یہ کہ کافی لوگوں نے اپنے رشتہ داروں کو بھی سپانسر کر کے بلوا لیا ہوا ہے۔ اب امریکہ کا ہر بڑا شہر برصغیر کے لوگوں سے جنہوں نے اپنے آپ کو 'دیسی' کا لیبل دے رکھا ہے' بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ نیویارک سے کئی اردو اخبار' رسالے' نکلتے ہیں۔ کلب' میوزیکل شوز' ٹی وی اور دیسی انٹرٹین منٹ کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کو ثقافتی قحط کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور دل بھی لگا رہتا ہے۔

ہر بڑے شہر کی طرح نیویارک میں بھی بیشتر سٹورز میں ہمارے دیسی بھائی بند ہی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ میں اور میری بہنیں ایک بار ایک شرارتی قسم کے سٹور کے آگے سے گزریں تو اپنی پُرتجسس نگاہوں سے اندر نظر دوڑانے سے خود کو باز نہ رکھ سکیں۔ ابھی ہم لوگ محض اوپری سطح کی تاک جھانک ہی کر رہے تھے کہ سٹور کے باہر بیٹھے ایک بھائی جان نے ہمیں ایک لُک دی جس کا مطلب تھا یہ آپ جیسی خواتین کے مطلب کا سٹور نہیں۔ آگے بڑھیئے اور رستہ ناپیئے۔ ''یا اللہ یہ باغیرت بھائی نام کی مخلوق امریکہ میں بھی ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی۔'' ہم نے ٹھنڈی سانس بھری اور ڈھیٹوں کی طرح نظریں جھکائے وہاں سے چل دیئے۔ ہماری قسمت ہی ایسی ہے' دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ جاتا ہے' اسی وقت ہماری چھٹی ہو جاتی ہے۔ نیویارک میں زیادہ تر ٹیکسی ڈرائیور بھی پاکستانی اور انڈین ہی نظر آتے ہیں اور یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہیں ہوگا کہ گندمی رنگ والے خواہ جغرافیائی طور پر برصغیر کے کسی بھی خطے سے ہوں' سواریوں سے بہت محبت سے پیش آتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے ہم وطن کو بٹھا کر چند ہی منٹوں کے سفر میں اپنی پوری داستانِ حیات بیان کر کے رکھ دی اور پھر کرائے کے پیسے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ پردیس میں ملنے والی ایسی بے لوث

محبت پا کر کئی بار دل گداز سے بھر جاتا ہے اور ان لوگوں کے لیے دل سے دعائیں اور نیک تمنائیں نکلتی ہیں۔

ٹائمز سکوائیر کی بغل میں واقع تھیٹر گلی یعنی براڈ وے سٹریٹ پہ بنا نیا میڈم تساڈ کا wax museum اپنی جھلمل کرتی بتیوں سے ہمیں بلا رہا تھا۔ برسوں پہلے لندن والا دیکھ تو رکھا تھا مگر ظاہر ہے کہ یہ مختلف تھا اس لیے سوچا اسے بھی دیکھنا چاہیے' لہٰذا ہم نے بیس ڈالر فی کس کے حساب سے ٹکٹ خریدے اور اندر چلے گئے۔ خوبصورت تین منزلہ پروقار میوزیم کئی نئے پرانے اداکاروں' فنکاروں' کھلاڑیوں' ادیب' سیاستدانوں کے مومی مجسموں کی نمائش گاہ تھی اور لوگ جوق در جوق انہیں دیکھنے چلے آ رہے تھے۔ شاید اس میں کچھ کریڈٹ ان میزبان لڑکے لڑکیوں کا بھی تھا جو لوگوں کو اندر لاتے ہوئے حد درجہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق سے ماحول بہت دوستانہ اور پر مسرت محسوس ہو رہا تھا اسی لیے تمام وقت شائقین کے لبوں پہ مسکراہٹ کھیلتی نظر آئی۔ ہم سب نے اپنی اپنی پسند کے مجسموں کے ساتھ تص -اور بشریٰ نے جو پاکستان ٹی وی کی نامور کامیڈین ہے مشہور امریکی کامیڈی لیڈی لوسی بال کے مجسمے کے ساتھ شرارتی سا پوز بنا کر تصویر اتروائی۔

بھوک زوروں سے چمک رہی تھ سوچا کیوں نہ آج Gyro کھائے جائیں۔ جائیرو ایک طرح سے ریڈی میڈ pita بریڈ کا سینڈوچ یا شوارما کا بہن بھائی کہلایا جا سکتا ہے۔ کسی نے بتایا تھا کہ نیویارک میں ہلٹن ہوٹل کے آگے عربی' دیسی' ریڑھیوں پہ (جنہیں وینڈنگ کارٹ کہا جاتا ہے) حلال جائیرو بیچتے ہیں لہٰذا ہم لوگ وہیں چلے گئے۔ سڑک کنارے متعدد ریڑھیوں پہ لبنانی' ترکی' پاکستانی مسلمان' پیاز مرچیں اور چکن ڈال کر گرما گرم روٹی کا جائیرو بنا کر بیچ رہے تھے۔ ہم لوگ قریب بنے فوارے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر کھانے لگے مگر یکدم سمی نے ایک زوردار چیخ مار کر ہمیں ڈرا دیا۔

اس نے دکھایا' جھاڑیوں میں چھپے موٹے موٹے چوہے لوگوں کے پھینکے ہوئے بچے ہوئے جائیرو کے ٹکڑے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ یہ تو پتہ تھا کہ نیویارک میں چوہوں اور کاکروچوں کی خاصی آبادی ہے مگر امریکن چوہوں کو یوں کھلے عام بہادری سے لوگوں کے قریب منڈلاتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کاشف بھی مجھے بتایا کرتا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے علاقے میں بھی بہت بڑے بڑے چوہے دندناتے پھرتے ہیں۔ سردی کے موسم میں برف میں پُھدکتے ہوئے چوہوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھ کر کئی بار وہ بھی ڈر جایا کرتا تھا۔

اگلے روز ہم پھر مین ہٹن سے بشریٰ کو لے کر نیویارک کی آوارہ گردی کرنے نکل گئے۔ دراصل نیویارک شہر کی رنگا رنگی اور رونقیں کسی کو گھر نہیں بیٹھنے دیتیں اور ہم بہنیں تو ویسے بھی چونکہ اتفاقاً اکھٹی ہوئی تھیں اس لیے ہم نے اس موقعہ کا فائدہ اٹھانے کی خاطر روز سیر سپاٹے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس روز ہم نے اپنا رستہ بدلا اور میڈیسن ایونیو پہ واقع راکی فیلر سنٹر کی خوبصورت بلڈنگ اور اس سے متصل سکیٹنگ رِنک دیکھنے چلے گئے۔ خوش باش لوگ رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے بیٹھ کر کھا پی رہے تھے اور شاپنگ کے شائقین سٹوروں میں آ جا رہے تھے۔ شاپنگ امریکنوں کا محبوب ترین مشغلہ ہے جسے دیکھو کچھ نہ کچھ خریدتا نظر آتا ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی راکی فیلر سنٹر کے بیچ کے پلیٹ فارم پہ ماڈرن آرٹ کی نمائش جاری تھی۔ اس بار کسی مجّسمہ ساز نے بڑے بڑے سیاہ رنگے لوہے کے مکڑوں کے ڈھانچے بنا کر سجائے ہوئے تھے۔ امریکن ان بڑے بڑے مکڑوں کو بے ضرر اور معصوم کہتے ہیں اور پیار سے ڈیڈی لانگ لیگز Daddy long legs پکارتے ہیں۔ ہماری تو مکڑوں اور اس قسم کے کسی بھی حشرات الارض سے جان جاتی ہے اس لیے ہمیں ان بڑے بڑے جناتی مکڑوں کے عین نیچے بیٹھنے سے گھبراہٹ سی

ہو رہی تھی۔ سُمّی نے البتہ اس کے نیچے کھڑے ہو کر بہت سی تصویریں کھنچوائیں۔

سنبل کو ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ دکھانے کی سوجھی مگر وہاں پہنچے تو دیکھا ٹورسٹوں کا ایک جمِ غفیر اوپر جانے کے لیے قطار میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ ٹکٹ بوتھ والے نے بتایا کہ کم از کم پینتالیس منٹ انتظار کے بعد ہی باری آئے گی۔ میرے دل میں یونہی خیال آیا کہ اتنی اونچی بلڈنگ اور کوئی سکیورٹی چیکنگ نہیں ہو رہی۔ امریکن واقعی بڑی اعتماد کرنے والی اور بے نیاز قوم تھی مگر یہ سب گیارہ ستمبر سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے بعد تو ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ بند کر دی گئی اور مجسمۂ آزادی بھی۔ ہم نے سنبل کو نیویارک کے پانچوں حصے Boroughs کی سیر کروا دی۔ کبھی ہم کوئینز، کبھی برانکس، کبھی بروکلین اور کبھی لانگ آئی لینڈ جا پہنچتے۔ سبھی حصے ایک دوسرے سے بہت دور ہیں مگر ٹرین کا نظام اتنا زبردست ہے کہ کہیں بھی پہنچنا آسان ہوتا ہے۔

اگست کے مہینے میں پورے امریکہ میں پاکستان ڈے کے حوالے سے میلے منائے جاتے ہیں، جن میں پاکستانی بہت گرم جوشی سے حصہ لیتے ہیں۔ بروکلین میں پاکستانیوں کی بہت بڑی آبادی رہائش پذیر ہے لہٰذا بروکلین کا میلہ بالکل شیخوپورہ کا میلہ لگتا ہے۔ جا بجا مسجدیں، حجام کی دکان، پاکستانی منی ٹرانسفر ایجنٹ، ہوٹل، حلال گوشت، اخبارات کے دفاتر کے سائن بورڈ لگے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم پاکستان کے ہی کسی شہر میں ہیں۔ یہ میلہ بروکلین کے لوکل تاجران آرگنائز کرتے ہیں اور وہی فنکاروں کو پاکستان سے بلا کر اپنے ہم وطنوں کو تفریح فراہم کرتے ہیں۔

میلے کا دن مقامی پاکستانیوں کے لیے گویا عید کا دن ہوتا ہے۔ لوکل انتظامیہ سے اجازت لینے کے بعد، پاکستان ہی کی طرح (جہاں اجازت لیے بغیر) سڑک بند کر دی جاتی ہے اور کرسیاں بچھا کر سٹیج سجا دی جاتی ہے۔ پاکستانی خواتین اور بچے رنگ برنگے شوخ کپڑے پہنے، مرد سونے کی چین گلے میں لٹکائے شلوار قمیض میں ملبوس ادھر سے

ادھر مٹر گشت کرتے' نان کباب کھاتے' سڑک پہ گند پھینکتے نظر آتے ہیں۔ نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے لوکل پولیس بھی موجود ہوتی ہے مگر انہیں چونکہ پاکستانی پلسیوں کی طرح ڈنڈے مارنے کی اجازت نہیں اس لیے وہ بس کھڑے ہٹ بٹ تکتے رہتے ہیں اور بار بار آنے جانے والے لوگوں کے آگے بے بس نظر آتے ہیں۔ امریکن پولیس فورس میں کئی پاکستانی بھی کام کرتے ہیں جن کو ایسے موقعوں پہ خاص طور پر تعینات کیا جاتا ہے۔

میلے میں بشریٰ کے علاوہ رفاقت' ابرارالحق' جنون گروپ' ہمایوں قریشی نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور خوب داد پائی۔ وہاں کئی بچھڑے ہوئے اور پرانے لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔ کسی نے پاس آ کر ہمیں سلام کیا تو ہم چونک گئے۔ ریڈیو سٹیشن کے ایک پرانے طبلہ نواز خورشید صاحب منہ میں پان گلے میں سونے کی زنجیر' تن پہ سلک شرٹ پہنے نظر آئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دس سال سے امریکہ میں مقیم ہیں اور سیٹ ہیں۔ کبھی واپس نہیں گئے۔

''کیا کرتے ہو یہاں'' سنبل نے حیرت سے پوچھا۔

''بس با جی اللہ کا بڑا کرم ہے۔ انڈین پاکستانی میوزک پروگرام ملتے رہتے ہیں روزی لگی ہوئی ہے۔ اب تک تو میں انڈیا کے سبھی سپر سٹارز کے پروگراموں میں طبلہ بجا چکا ہوں۔'' اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

''خورشید پاکستان یاد نہیں آتا؟'' سنبل نے اگلا سوال پوچھا۔

''کیوں نہیں با جی۔ بہت یاد آتا ہے۔ جب بیوی کہتی ہے واپس نہیں آنا؟ تو دل کٹ کے رہ جاتا ہے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں میں روزانہ گھر فون کرتا ہوں۔'' وہ نم آنکھوں سے بولا۔

''گھر بنا لیا ہے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ ایک کی تو شادی بھی ہوگئی ہے۔''

خورشید جیسے کئی لوگ امریکہ میں غیر قانونی طور پر چُھپ چُھپا کر ڈالر کما کر گھر بھیجتے رہتے ہیں تا کہ ان کے گھر والے آسودہ رہیں، مگر وہ خود واپس نہیں جا سکتے کیونکہ واپس گئے تو پھر دوبارہ امریکہ نہیں لوٹ سکتے اور درختوں سے لگے سبز سبز ڈالروں کی کشش ان کے پیروں میں پکی پکی بیڑیاں ڈال دیتی ہے۔

لانگ آئی لینڈ نیو یارک کا علاقہ شہر سے ہٹ کر واقع ہے۔ وہاں رہنے والے پاکستانی زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ، متمول اور ویل اسٹیبلشڈ ہیں۔ وہاں کے خوبصورت آئی زن ہاور پارک Eisenhower park میں ایک خوبصورت پاک امریکن نائٹ کی تقریب اٹینڈ کرنے کا موقع ملا تو بہت لطف آیا۔ جھلمل کرتی دھیرے دھیرے بہتی جھیل کنارے بڑے سے خوبصورت سٹیج کو بڑے باوقار انداز سے سجایا گیا تھا۔ پاکستانی ٹین ایج بچوں نے پاکستانی کپڑے پہن کر علاقائی رقص پیش کیے اور فنکاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ وہیں ہماری ملاقات منو بھائی اور جاوید شاہین سے ہوئی جنہیں پاکستان پوسٹ اخبار کے ایڈیٹر اپنے ساتھ لائے تھے۔ منو بھائی سے تو پاکستان میں بھی نیازمندی رہتی ہے لیکن عجیب بات ہے پردیس میں ملاقات ہو تو دلوں میں بہت سا پیار بھر جاتا ہے اور ایک نئی سی اپنائیت اور قربت محسوس ہونے لگتی ہے۔ میں نے اگلے روز اپنی پھوپھی پروین عاطف کو فون پہ بتایا کہ مجھے منو بھائی اور جاوید شاہین ملے تھے۔ پوچھنے لگیں ''وہ دونوں وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''مشاعرے پڑھنے آئے ہوئے ہیں۔'' میں نے منطقی جواب دیا ''تقریبات اٹینڈ کر رہے ہیں۔''

''پروین کو کچھ عرصے پہلے ہی امریکہ کا ویزا ریجیکٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ بہت غصے میں تھیں۔ وہ اپنے بیٹے شکوہ سے ملنے امریکہ آنا چاہتی تھیں مگر انھیں ویزا ہی نہیں مل رہا تھا۔'' یہ امریکن نہ جانے شاعروں اور فنکاروں کو ہی ویزے کیوں دیتے ہیں۔

لگتا ہے مجھے بھی شاعری شروع کرنی پڑے گی۔'' انھوں نے جل کر کہا۔

بشریٰ اور سنبل کے لیے امریکہ میں کھانے کا مسئلہ بھی بہت بڑا مسئلہ تھا۔ میں تو جو ملے کھا لیتی ہوں مگر بشریٰ امریکی کھانوں کی بالکل شوقین نہیں اور کئی کئی دن دودھ بسکٹ پہ گزارا دیتی ہے۔ سنبل کو بھی جب تک گھر کا پکا ہوا سالن اور روٹی نہ ملتی وہ بے کل رہتی۔ اب تو خیر نیویارک میں چپے چپے پہ انڈین اور پاکستانی ریسٹورنٹ کھلے ہوئے ہیں اس لیے تھوڑا سا ڈھونڈنے کے بعد کھانا مل جاتا ہے مگر اس پہ خرچ تو اٹھتا ہی ہے۔ ایک روز ہم سٹیٹن آئی لینڈ سے مین ہٹن کے لیے نکل رہے تھے تو بشریٰ نے اپنے ہوٹل سے فون کر کے گھر کا کھانا لانے کی فرمائش کر ڈالی۔ میری چھوٹی بہن کہے اور میں اس کا کہنا ٹال دوں' یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ میں نے جلدی جلدی قیمہ آلو پکایا' دھنیا گرم مسالہ چھڑکا' آٹھ دس پراٹھے بنائے' سلاد کاٹا اور سارا سامان اچھی طرح پیک کر کے ایک بیگ میں ڈال کر لے جانے کے لیے تیار کر دیا۔

فیری پہ حسب معمول کافی رش تھا لیکن ہم وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئے تھے۔ میں نے بیگ آرام سے ایک طرف رکھ دیا اور انتظار گاہ میں بیٹھ کر سمی سے باتیں کرنے لگ گئی۔ فیری اتفاقاً لیٹ آئی حالانکہ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا۔ رش بڑھ گیا تھا اس لیے انھوں نے اکھٹی دو فیریز چلانے کا بندوبست کر دیا۔ جیسے ہی بھونپو بجا ہم سب اٹھ کر بھاگے اور جا کر اپنی پسند کی نشستوں کو قابو کر لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں فیری چل پڑی اور ہم ہوا کے شریر جھونکوں کی چھیڑ خانی سے مدہوش ہونے لگے۔ یکا یک مجھے آلو قیمہ والے بیگ کا خیال آیا۔ اوہ خدایا...... وہ تو میں فیری سٹیشن ہی پہ بھول آئی تھی۔ ہائے اتنی محنت سے پکایا تھا میں نے۔ سخت افسوس ہونے لگا۔ ہائے میری بہن کتنی شدت سے کھانے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی مایوسی کا خیال آیا تو دل اور زیادہ دُکھنے لگا۔ اپنے آپ کو سدا کی بھلکڑ ہونے پہ خوب کوسا۔ ہم بھاگم بھاگ فیری سے اتر کر دوبارہ

واپس جانے والی فیری میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے سوچا آخر بیگ وہیں رکھا ہوگا۔ امریکہ میں اکثر گمشدہ چیز مل ہی جاتی ہے اسے کوئی نہیں اٹھاتا اور وہ وہیں پڑی رہتی ہے۔

ہمیں واپسی میں وہی خوبصورت نیلے پانی کا سفر کالے پانی کا سفر لگ رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ دو گھنٹے میں گزرا اور فیری رکتے ہی ہم بھاگم بھاگ پھر ٹرمینل پہ جا پہنچے۔ سارا ویٹنگ ایریا چھان مارا مگر کھانے والا بیگ کہیں نہ ملا۔ سوچا شاید صفائی کرنے والوں نے اٹھا کر کوڑا دان میں پھینک دیا ہو' اگر پیک شدہ بند کا بند اوپر ہی کہیں پڑا ہوا ہو تو اٹھا لیں گے' کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے ڈرم کے اوپر بھی طائرانہ نظر ڈالی مگر گوہر مراد کہیں نظر نہ آیا۔ یکدم ایک ہوم لیس بیگ لیڈی پہ نظر جا ٹکی۔ جو اپنا سارا اسباب زندگانی ایک شاپنگ کارٹ میں ڈال کر اکثر اِدھر سے اُدھر گھومتی نظر آتی تھی۔ رات کو بنچ پہ سو جاتی اور دن میں فیری پہ بیٹھی خوامخواہ اس پار سے اس پار کا سفر کرتی رہتی تھی۔

ہوم لیس بیگ لیڈی یعنی بے سہارا بے گھر فقیرنی ایک بنچ پہ بیٹھی بڑے مزے سے میرے ہاتھ کے پراٹھے کا رول بنا کر کھا رہی تھی اور پلاسٹک کے چمچے سے (جو میں نے ہی پیک کیا تھا) قیمہ آلو اپنے پاس کھڑے کتے کے منہ میں پیار سے ڈال رہی تھی۔ ہم تینوں ہائے ہائے کر کے رہ گئے اور اس روز میرا اس بات پہ ایمان مزید پختہ ہو گیا کہ دانے دانے پہ مہر ہوتی ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ وہ کھانا جس کی قسمت میں تھا اسی کو ملا اور ہم خالی ہاتھ پھر سے سفر پہ روانہ ہو گئے۔

ایک روز ہم نے برانکس جا کر میری بیٹی عنبر کی ساس کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام بنایا۔ میری سمدھن بڑی ہی خوش اخلاق اور وسیع القلب خاتون ہیں۔ کُھلی ڈُلی طبیعت رکھتی ہیں لہٰذا ان سے بے تکلفی کا رشتہ رہتا ہے۔ انھوں نے ہمیں اپنے محلے فورڈھم کے سٹورز میں شاپنگ کی دعوت دی اور ہم پیدل روانہ ہو گئے۔ اس روز ہم دونوں نے

اتفاقاً شلوار قمیض کے بجائے لانگ سکرٹ پہن رکھے تھے لہٰذا ہماری قومیت کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں تھا۔ چلتے چلتے ہم ایک بڑے سے جیولری سٹور کے آگے سے گزرے مجھے یکدم خیال آیا کیوں نہ یہاں اپنی پرانی انگوٹھی بیچنے کی کوشش کروں جس کے دو ننھے ننھے ہیرے جھڑ کر گر چکے تھے اور بارہا ٹھیک کروانے کے باوجود اب اس انگوٹھی کی سیٹنگ صحیح نہیں رہی تھی۔ اگر اچھی قیمت مل جائے تو کتنا اچھا ہو' میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اندر چلی گئی۔ کاؤنٹر کے پیچھے دو تین مرد بیٹھے تھے۔ دیکھنے سے کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کون تھے؟ ہسپانوی (سپینش) لگتے تھے۔ ویسے بھی برانکس ہسپانوی لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ ''کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟'' ایک شخص نے آگے بڑھ کر پوچھا ''یہ میری انگوٹھی کچھ پرانی ہو گئی ہے' میں اسے بیچ کر نئی لینا چاہتی ہوں۔ اس کی ذرا قیمت لگوانی ہے۔ پینتیس چالیس برس کی عمر کے شخص نے مجھے اور میری سمدھن کو بغور دیکھا اور پھر انگوٹھی کو الٹنے پلٹنے لگا۔ ہم دونوں آپس میں پنجابی میں تبادلۂ خیالات کرنے لگیں۔ یکایک وہ بغیر کسی تاثر کے بولا۔

''لاہوروں آئے ہو؟''

فقرہ ایسا تھا کہ اس کے سنتے ہی گویا اپنائیت کے دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ ہم دونوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ اس ہم وطن نے ہمیں بتایا کہ وہ کئی سالوں سے برانکس میں اپنے بال بچوں سمیت رہائش پذیر ہے' مگر غیر قانونی ہونے کی وجہ سے واپس نہیں جا سکتا۔ 'لاہور کی یاد نے دل میں پھٹ لگا دیئے ہیں' اس نے اپنا کالر ذرا سا سرکا کر ہمیں اپنی اوپن ہارٹ سرجری کا کٹ دکھایا۔ ''آپ لوگ میرے لاہور کے ہیں' آپ سے مل کر مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔'' وہ جذباتی ہو گیا۔ آپ میری بہن ہیں لہٰذا میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اپنی یہ انگوٹھی نہ بیچیں کیونکہ اس کا آپ کو کچھ نہیں ملے گا'

لیکن یہ دیکھیں اس میں سے دو ہیرے گر چکے ہیں۔ بُری لگتی ہے ایسے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں اسے ٹھیک کر دیتا ہوں۔''

نہ بابا نہ! امریکہ میں کوئی چیز ٹھیک کروانا؟ بہت مہنگا پڑے گا مجھے۔'' میں نے انگوٹھی جلدی سے واپس لیتے ہوئے کہا۔

''باجی آپ فکر کیوں کرتی ہیں میں آپ کو فری میں دو ہیرے لگا کر دوں گا۔''

''فری؟ وہ کیوں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''اور یہ میں کیسے یقین کرلوں آپ واقعی سچ مچ کے ہیرے ہی لگا کر دیں گے؟'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

یہ دیکھیں میں آپ کو اس ڈائمنڈ ٹیسٹر سے ٹیسٹ کر کے دکھا دیتا ہوں کہ ہیرے سچے ہیں یا نہیں۔ آپ مجھ پہ اعتماد کیجیے۔ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''لیکن آپ یہ سب کیوں کریں گے؟'' میں نے پھر جرح کی۔

''کیونکہ آپ میرے لاہور سے آئی ہیں، وہ لاہور جہاں میں جا نہیں سکتا۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا اور میں نے خاموشی سے انگوٹھی اس کے حوالے کر دی۔ اس نے چھوٹے چھوٹے دو ہیرے خالی جگہ پہ نصب کر دیئے اور کوئی پیسہ نہیں لیا۔ مجھ پہ ایک اجنبی ہم وطن نے پھر مہربانی کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملاتے چھوڑ کر میں نے اسے شکریہ کہا اور وہاں سے رخصت ہو لیئے۔

سنبل میں اور سمی ایک روز نیویارک نوردی کرتے کرتے مین ہٹن کے خوبصورت باوقار سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل جا پہنچے۔ بھری دوپہر میں نیویارک ہنس بس رہا تھا۔ بسیں، ٹیکسیاں، کاریں، زندگی کی آوازیں اور مصروفیت کا شور، چاروں طرف رونق اور ہما ہمی تھی مگر جیسے ہی ہم St.Patricks Cathedral کا بڑا سا قدیم چوبی

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو ایسا محسوس ہوا گویا کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ ایسی دنیا جہاں صرف سکون، خاموشی اور امن چین راج کرتا ہے۔ جہاں چین کی بنسی بجتی ہے اور ہر وقت مسحور کن پاکیزگی کی دھند چھائی رہتی ہے۔

پرانی لکڑی کے بنے خوبصورت بنچوں والا بڑا سا پرشکوہ ہال اتنا خاموش تھا جیسے وہ گہما گہمی والے نیویارک سٹی کے مین ہٹن ایریا میں نہیں ہے۔ جیسے کسی نے اسے اٹھا کر چپکے سے کسی سنسان، غیر آباد صحرا میں لا کر رکھ دیا ہو۔ ہم لوگ اندر کیا آئے یوں محسوس ہوا جیسے تپتی دھوپ سے نکل کر یکا یک کسی نیم کی ٹھنڈی چھاؤں تلے آ گئے ہوں، بیمار کو بے وجہ قرار آ گیا ہو۔ کچھ عقیدتمند، ضرورتمند، گھٹنے ٹیکے بائیبل کھولے عبادت میں مصروف تھے اور چند بنچوں پہ گم صم خاموش بیٹھے تھے۔ نہ جانے کیا سوچ رہے تھے، وہ نہ جانے کیوں بیٹھے تھے وہاں؟ یوں جیسے انہیں نہ کسی کے جانے کا دکھ تھا اور نہ کسی کے آنے کا انتظار، نہ کسی دل شکستگی کا ملال تھا اور نہ کسی ہونی کی تمنا۔ جیسے دُکھ کی جھونپڑی ان کا گھر تھی، جہاں وہ محبت کے نرم و ملائم بچھونوں پہ لیٹے بے وفائیوں کے پتھریلے تکیوں پہ سر دھرے تمام رات جاگتے رہے ہوں۔ ان خاموش بتوں میں، میں خود بھی کہیں موجود، چپ بیٹھی تھی:

سب نے اپنی ہنجو مالا کلم کلیاں چینی اے

اس سے پہلے کہ بارعب سناٹا میرے دل کو مٹھی میں لے کر اور پچکا دیتا چرچ کی چھت پہ نصب بڑے سے پیتل کے آرگن سے بکھرنے والی موسیقی نے ہمیں چونکا دیا۔ خوبصورت سُر اور ان سے آنے والا نشہ تو سنبل اور میری کمزوری ہیں ہم دونوں کے چہروں پہ موسیقی سنتے ہی مسکراہٹ ناچنے لگی۔ چرچ سروس شروع ہونے والی تھی، لوگ دھیرے دھیرے اندر آ کر خاموشی سے ہال کو بھرنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد دو پادری سفید عبائیں پہنے اندر آ گئے اور بائیبل میں سے آیات پڑھنا شروع کر دیں۔

کچھ خواتین تسبیح پھیرتی بھی نظر آ رہی تھیں۔ خدا کی شان میں گائی جانے والی Hymns (حمد) سن کر ہمارا بھی دل جھوم اٹھا۔ گا کر یار منایا جا رہا تھا اور بڑا مزا آ رہا تھا۔ یار کہیں پاس ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ''اے اللہ میں حاضر ہوں۔'' میں نے اس ذات پاک کی موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اسے اپنے اندر اتار لیا۔ فضا میں تیرتی ہوئی موسیقی میں ایک ایسی میٹھی لذت تھی جس کا تعلق سراسر روح سے ہوتا ہے جس خدا نے موسیقی جیسی خوبصورت' پرسکون اور دل کے تاروں کو چھیڑ دینے والی چیز تخلیق کی' اپنے انسانوں میں بانٹی' ہواؤں کو بخشی' پرندوں کو عطا کی' وہ خود کتنا مترنم اور خوبصورت ہو گا۔ اللہ جمیل ویحب اللہ جمال یعنی (اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی پسند کرتا ہے۔) بگ بینگ Big bang ہوا' تخلیق کی گھنٹی بجی' موسیقار نے سُر چھیڑے اور کائنات وجود میں آ گئی۔ خوبصورت کائنات' خوبصورت دنیا' خوبصورت اللہ۔

سینٹ پیٹرک چرچ اللہ کا گھر ۱۸۵۸ء میں تعمیر ہوا اور پھر ۱۸۷۱ء میں عوام کے لیے اس کے دروازے کھول دیے گئے۔ اس میں بیک وقت ڈھائی ہزار لوگ بیٹھ کر عبادت کر سکتے ہیں۔ نیویارک کے لوگوں کے لیے یہ ''داتا صاحب'' کی طرح ہے۔ جو بھی نیویارک آتا ہے' اس داتا صاحب کے مزار پر حاضری دینے ضرور جاتا ہے۔ اس چرچ میں کوئی مزار نہیں مگر مذہبی عقیدت رکھنے والے لوگ اس چرچ کے شیدائی ہیں اور اس کے گوتھک طرز تعمیر کے جاہ و جلال کے گن گاتے ہیں۔ واقعی یہ کیتھیڈرل اتنا پیارا ہے کہ اس کے سحر میں گم ہو جانا کوئی مشکل بات نہیں۔

میں نے گردن اٹھا کر نظر دوڑائی' رنگدار شیشوں (سٹین گلاس) پر بنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے مناظر میرے اردگرد جلوہ گر تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے مصوّروں کے ہاتھوں کی پینٹ شدہ عیسائی سنتوں saints کی پُروقار شبیہ اور چار سو

فٹ اونچی چھت کی بلندی آسمان کی وسعتوں کو چھوتی محسوس ہوتی تھی۔ ہم کچھ دیر کو خاموشی سے چرچ سروس سنا کیئے پھر اٹھے' بڑا سا چوبی دروازہ کھولا اور دوبارہ سے دنیا کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ باہر نیو یارک ہنس رہا تھا' مسکرا رہا تھا' دھڑک رہا تھا اور خدا وہاں بھی موجود تھا۔

نیو یارک میں گھومتے ہوئے آپ کو اکثر چھوٹے چھوٹے سٹینڈ پہ رکھے پرنٹڈ بروشر مل جاتے ہیں جن میں شہر میں ہونے والے پروگراموں کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ انہیں دیکھیں تو آپ آسانی سے اپنا تفریحی یا جیسا بھی چاہیں شیڈول بنا سکتے ہیں اور "never a dull moment" والی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہر ایک کی انفرادی دلچسپی کے لیے شہر میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی موقعہ اور محل ضرور مل جاتا ہے۔ اسی طرح ایک روز چلتے چلتے میں نے ایک بروشر اٹھایا تو اس میں لنکن سنٹر میں ہونے والے ایک پروگرام کے بارے میں پڑھ لیا۔ یہ انڈیا کے علاقائی رقص کا ایک پروگرام تھا جو اگلے روز دوپہر کو لنکن سنٹر کے سامنے اوپن ائیر میں ہونا تھا جہاں اکثر ان کے آرٹ اور کلچر کے فری پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔

میں اور بچے وقت مقررہ پہ وہاں جا پہنچے۔ اس روز نیو یارک میں پاکستان جیسی گرمی پڑ رہی تھی۔ ہم چاروناچار تپتی دھوپ میں کھلے آسمان تلے بچھی کرسیوں پہ بیٹھ گئے اور پروگرام دیکھنے لگے۔ رنگ برنگی چنریوں میں ملبوس عورتوں اور مردوں نے سروں پہ گاگریں سجا کر حیدر آباد دکن کے مخصوص رقص پیش کیے اور خوب داد پائی۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے فنکار بار بار کولر سے پانی پیتے اور پھر اپنی پرفارمنس میں مصروف ہو جاتے۔ عوام کے لیے یہ فری شو تھا اس لیے لوگ خاصی تعداد میں اسے دیکھنے آئے۔ میرے دل میں خیال آیا انڈیا کا ہمیشہ ہی مغرب میں بول بالا رہتا ہے کیونکہ ان کے ہاں آرٹ اور کلچر کو حکومتوں کی سرپرستی حاصل رہتی ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ ایسا نہیں

ہے لہٰذا ہم اپنے گھٹیا فلمی ڈانسوں کے علاوہ کہیں کچھ اور نہیں پیش کر سکتے۔ ایک ناہید صدیقی صاحبہ ہیں ہیں جنہوں نے پاکستان میں رقص کے فن کو عزت بخشی مگر پاکستان میں انہیں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا نصیب ہی نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنی گٹھڑی اٹھائے دیس پردیس پھرتی رہتی ہیں کہ انہیں اپنے فن کو زندہ رکھنا ہے، مارنا نہیں

☆☆

اگست ختم ہوتے ہی سُمی واپس بفلو یونیورسٹی چلی گئی کیونکہ ستمبر کے پہلے ہفتے میں اس کی کلاسیں شروع ہونے والی تھیں۔ سنبل کو فلاڈلفیا ہمارے کزن ڈاکٹر آفتاب کے گھر جانا تھا کیونکہ ان کی بیگم لبنیٰ بہت محبت سے اسے بلا رہی تھیں لہٰذا ہم نیویارک سے کار میں فلاڈلفیا کو چلے۔ راستہ تقریباً تین گھنٹے کا تھا جو مزے سے کٹ رہا تھا۔ امریکہ کی ہائی ویز پہ جب گاڑی چل رہی ہوتی ہے تو میرے دل میں یہ حسرت ضرور پیدا ہوتی ہے کہ کاش پاکستان میں بھی ایسی ہی منظّم مربوط شاہراہوں کا جال بچھ جائے اور آمدورفت آسان ہو جائے۔ شکر ہے ایک ہائی وے بنی تو ہے مگر ایک کہاں کافی ہے۔ امریکہ میں دیگر سہولیات کے ساتھ ساتھ سفری سہولیات بھی شہریوں کے لیے زندگی کتنی آسان کر دیتی ہیں۔ بس گاڑی میں پٹرول ڈلوایا' نقشہ ساتھ لیا' ایک عدد نئے یا پرانے ہم سفر کو پہلو میں بٹھایا اور چل دیئے۔ زندگی ہوگئی رواں دواں۔ اپنے پاکستان میں کہیں جانا ہو تو سفر کا خیال آنے سے پہلے ہی متوقع جسمانی دردوں کی وجہ سے زبان سے ہائے ہائے نکلنے لگتی ہے۔

روٹ ۹۵ پہ گاڑی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ میں ان نئے نئے چمکتے ہوئے سائن بورڈز کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد نظر آ رہے تھے۔ تحریر کچھ یوں تھی ''کل اوزون ایکشن ڈے ہے' یاد رکھیے اور احتیاط کیجئے۔ گاڑی میں صرف رات کو پٹرول ڈلوایئے۔''

کیا اوزون Layer کو بچانے کی خاطر کوئی جلسہ میٹنگ وغیرہ ہو رہی ہے۔ کس بات کا ڈے منایا جا رہا ہے؟'' میں نے بیٹے سے سوال کیا۔

''امی آپ نے سنا نہیں' کل سو ڈگری ٹمپریچر ہوگا نا اس لیے اوزون زیادہ

active ہوگا یعنی اوزون کا چھید پھیل کر اور بڑا ہو جائے گا اور تابکاری زیادہ نیچے ٹپکنے لگے گی۔'' کاشف بیٹے نے بڑے مدبرانداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''مگر پٹرول رات کو کیوں ڈلوانے کو کہا ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''امی جی' آپ نے ٹی وی پہ خبریں نہیں دیکھیں؟ کہہ رہے ہیں دن میں چونکہ چھید بڑا ہو جائے گا لہٰذا پٹرول ڈلواتے ہوئے جو fumes خارج ہوں گے وہ اوپر جا کر اوزون کو اور زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ رات میں ٹمپریچر کم ہوگا تو چھید بھی چھوٹا ہو جائے گا اس لیے ماحولیاتی آلودگی کم ہوگی۔''

''اللہ اللہ ان امیر ملک کے لوگوں کے نخرے۔'' سنبل ہنس دی۔ ''لو بھلا یہ سوڈ گری گرمی ہمیں کیا ڈرائے گی؟ کیا ہمارے پاکستان کے اوپر یہی آسمان نہیں تنا ہوا؟ اور کیا وہ منحوس چھید ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتا؟ ہم تو پرواہ نہیں کرتے! ایسی باتوں کی۔'' سنبل مزید تبصرہ کرتے ہوئے بولی۔

''گرمی سردی ہمارے ملک کے لوگوں کے لیے کہاں کوئی معنی رکھتی ہیں؟'' میں نے بھی اپنا اظہار خیال کیا۔ ''شدید گرمی میں ہماری عوام سڑکوں پہ چلتے پھرتے' اپنے روزمرّہ کے کام نمٹانے میں مصروف رہتی ہے۔ مسافر تیز دھوپ میں ویگن سٹاپوں پہ کھڑے رہتے ہیں' محنت کش مزدوری کرتے ہیں۔ بچے درختوں سے امبیاں توڑتے' عورتیں تنور دہکاتی ہیں' سبھی کچھ تو ہوتا رہتا ہے۔ کاروبار حیات چلتا رہتا ہے۔ وہاں کب کسی کو خبر ہوتی ہے کہ اس کے حصے کا آسمان ذرا سا پھٹا ہوا ہے اور اس میں سے قطرہ قطرہ زہر نیچے رِس رہا ہے۔''

''ارے یہ کیا! گاڑی آہستہ کیوں کر رہے ہو بیٹا؟'' سنبل نے کاشی سے پوچھا جو ایک بل کھاتی سڑک پہ دھیمے ہو رہا تھا۔'' وہ دیکھیے اس نے گاڑی کو مزید آہستہ کر دیا اور ہم نے سائڈ واک پہ لگا سائن پڑھا جس پہ لکھا تھا:

"Cattle crossing" یعنی بھیڑ بکریوں کی گزرگاہ۔

''یہاں تو کسی بھیڑ بکری کا دور دور تک نام ونشان نہیں' میرا مطلب ہے گاڑی سے باہر!''سنبل نے ہنس کر کہا۔

''جی خالہ لیکن یہاں کسی بھی وقت اچانک کہیں سے ایک ریوڑ آ سکتا ہے' اس لیے دھیان سے گاڑی چلانے کو کہا گیا ہے۔'' بیٹے نے سمجھایا۔

''بلے بھئی احتیاطاں تیریاں اے امریکہ''سنبل ہنس دی اور تبھی مجھے خیال آیا کہ سعودی عرب میں جہاں کہ کثرت سے شادیاں کی جاتی ہیں' سنتے ہیں کہ عورتیں اور بھیڑ بکریاں سوزوکی پک اپ میں پیچھے اکھٹی ہی بٹھا دی جاتی ہیں بلکہ بھر دی جاتی ہیں اور پھر ہند و پاک کے کئی پسماندہ علاقوں میں تو آج بھی عورت کو ایک بیل کی طرح جوت کر اس سے کھیتوں میں ہل چلوایا جاتا ہے۔ میرے خیالوں کا پنچھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ یکا یک بیٹے کی آواز نے حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔

''یہ دیکھئے Deer crossing کا سائن یعنی یہاں سے ہرن گزرتے ہیں۔ اب آپ اپنے آپ کو بلا شبہ ایک ہرنی سمجھ لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''ہرن صاحب کو جب پیاس لگ جائے تو وہ ہائی وے پھلانگ کر پانی پینے دریا کی طرف بھاگ پڑتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی تیز رفتار گاڑی ان سے ٹکرا جائے تو اس ہرن گزرگاہ پر سے لوگ جان سے بھی گزر جاتے ہیں۔'' مجھے ماضی میں ہونے والے کئی ہرن ایکسیڈنٹ یاد آ گئے۔ جن میں اللہ کا شکر ہے ہم ہمیشہ بچے رہے مگر کئی بار ایسا ہوا کہ اچانک ہرن نے سڑک پار کر لی اور گاڑی بے قابو ہو گئی۔

''اب دیکھئے خالہ Falling Rock Zone شروع ہو گیا ہے۔'' کاشف نے پھر چھیڑا۔

''اب کیا یہ چٹانیں سر پر آن گریں گئیں؟ توبہ کتنی خوفناک ہائی وے ڈرائیونگ

ہے۔تمہارے امریکہ کی۔''سنبل نے منہ بنایا۔

''خالہ جان یہ چٹانیں کچی ہیں ان پر سے کوئی سنگریزہ گر کر ہماری گاڑی کو لگ سکتا ہے۔اسی لیے احتیاط کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔''

کاشف نے جواب دیا۔

''بس سنگسار ہونے کی ہی کسر رہ گئی تھی...... وہ بھی کر لو امریکہ والو۔''سنبل نے فقرہ کسا اور کار میں قہقہے گونجنے لگے۔

اگلا سائن دیکھ کر میں کچھ سنجیدہ ہوگئی۔ M.A.D.D نامی سائن کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ''غصہ میں۔'' دوسرے کا مطلب ہے کہ یہاں ان ماؤں کی تنظیم سرگرم عمل ہے جن کے بچوں کو ڈرائیوروں نے شراب کے نشے کی حالت میں ٹریفک ایکسیڈنٹ کر کے مار ڈالا ہے۔M.A.D.D. مخفف ہے:

"Mothers against Drunk driving" کا۔

امریکہ میں ڈرنک ڈرائیونگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔روزانہ بہت سے لوگ اس کی وجہ سے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔اب پہلے کی نسبت اس کے خلاف کافی ایکشن لیا جاتا ہے۔ ناراض ماؤں کی اس تنظیم نے امریکہ میں اس لعنت کے خلاف کافی شعوری بیداری پھیلائی ہے۔ مجھے بھی اس کا تھوڑا سا اندازہ ہوا جب گزشتہ برس مجھے اپنے ڈرائیونگ لائسنس کا دوبارہ اجرا کروانا پڑا۔میرے پاکستان آنے جانے کی وجہ سے میرا لائسنس ایکسپائر ہو چکا تھا اس لیے تقریباً پچیس سال بعد مجھے دوبارہ تحریری اور ڈرائیونگ ٹیسٹوں کے مرحلوں سے گزرنا پڑا جو کہ اتنے سالوں بعد بہت مشکل لگا۔

ماضی میں دیئے گئے ڈرائیونگ ٹیسٹ اور حال کے ٹیسٹ میں بہت فرق تھا۔اب کے ٹیسٹ کے سوالات میں شراب نوشی اور اس سے متعلق اتنے سوالات تھے کہ میں سٹپٹا کر رہ گئی۔خون میں شراب کی مقدار کی فیصد، نشہ ہو جانے کی مختلف کیفیات گریز،

ڈرائیونگ پہ اس کے اثرات وغیرہ سے متعلق اتنے مہین اور تفصیلی سوالات پوچھے گئے کہ رٹے لگانے کے باوجود میں فیل ہوگئی حالانکہ اپنی طرف سے سبق پوری طرح یاد کر کے گئی تھی۔ اب کیا بتاتی کہ بھائیو جب یہ کا فرمنہ کو لگی ہی نہیں تو اس کے بارے میں اتنی معلومات کا میں کیا جواب دوں گی؟

مجھے ذاتی طور پر شاپنگ کا اتنا زیادہ شوق نہیں مگر سنبل کا اشتیاق دیکھ کر میں بھی اس کے ساتھ سٹوروں، شاپنگ مالوں میں گھومتی رہی اور سوچتی رہی کہ یا اللہ انسان کی حسرتیں اور خواہشیں کبھی پوری کیوں نہیں ہوتیں! ہم تمام عمر خوشیوں کی طلب میں نت نئی چیزیں خریدتے اور ان سے دل بہلاتے رہتے ہیں مگر پھر بھی ہوتا یہ ہے کہ ہر خواہش پہ ہی دم نکلا جاتا ہے۔

امریکہ شاپنگ کے شوقینوں کے لیے جنت ہے کیونکہ اس کے بازاروں میں ایسی ایسی نادر، انوکھی اور خوبصورت اشیاء نظر آتی ہیں کہ دل للچانے لگتا ہے اور جیب خود بخود ہلکی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ امریکہ ایک کیپٹلسٹ ملک ہے اور ان کو کنزیومر مارکیٹ کو قابو کرنے کا ہنر آتا ہے۔ ہر شہر میں ۹۹ سینٹ یا ایک ڈالر کی قیمت کی چیزوں کے سٹور بکثرت نظر آتے ہیں۔ گاڑی خریدنا ہو یا بسکٹ کا ڈبہ، قیمت ہمیشہ ۹۹ کے پھیر میں ہی رہتی ہے۔ جیسے کہ کار کی قیمت ہوگی ۸۹۹۹ ڈالر پورے نو ہزار کبھی نہیں تاکہ خریدار ہمیشہ نفسیاتی طور پر یہی سوچتا رہے کہ سودا مناسب ہے برا نہیں۔ منی میکنگ اور ڈالر کمانے کے گورکھ دھندے میں پھنسے امریکنوں کی پوری زندگی چوہوں کی دوڑ بنی رہتی ہے حتیٰ کہ ایک دن سارے سانس ختم ہو جانے کا دن آ جاتا ہے اور زندگی کی پتنگ کٹ جاتی ہے۔

ہم نے بھی شاپنگ میں خوب وقت صرف کیا۔ جوتے، پرس اور تحائف کے طور پر لوشن، کریمیں، پرفیومز خریدے۔ پاکستان میں بھی اب سب کچھ اسی قیمت میں اور

آسانی سے مل جاتا ہے مگر رسم ورواج کے تقاضے ایسے ہیں کہ اگر آپ بیرون ملک کے سفر کے بعد سامان بکسوں میں لاد ' انہیں گھسیٹ' اپنے بازو تڑوا کر' گرتے پڑتے' لڑکھڑاتے ائیر پورٹ سے نہ اتریں تو اقرباء یہی سمجھتے ہیں کہ آپ کو ان کا خیال ہی نہیں۔ آپ خالی بکسے لیئے' ہلکے پھلکے آ گئے تو اس کا مطلب ہے آپ کو ان سے کوئی محبت نہیں۔ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی خوامخواہ احساسِ جرم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کچھ نہ کچھ لانا ہی پڑتا ہے۔

اگست ۲۰۰۱ء کے تقریباً آخری ہفتے کی بات ہے میں اور میری بیٹی عنبر جو ریڈرز ڈائجسٹ جیسے باوقار ادارے میں جاب کرتی ہے' فون پہ باتیں کر رہے تھے۔ یکدم عنبر کہنے لگی ''امی رات میں نے بڑا عجیب خواب دیکھا ہے'' ''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے دیکھا کہ نیویارک کے سارے پُل بند ہو گئے ہیں اور ان پہ کوئی ٹریفک نہیں ہے' مگر لوگ انہیں پیدل چل کر کراس کر رہے ہیں۔'' عنبر کو پہلے بھی کئی بار ایسے ویسے خواب آتے رہتے ہیں۔

''لو بھلا یہ کیا خواب ہوا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ سارے پُل بند ہو جائیں اور میلوں لمبے پُلوں پر لوگ پیدل چلنے لگیں۔'' میں نے جواب دیا کیونکہ امریکہ میں کسی بھی برج پہ لوگوں کا چلنا غیر قانونی ہے اور قانون کی تو وہاں ہر صورت پابندی کی جاتی ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی اور ہم بھول بھال گئے۔

سمر آف ۲۰۰۱ء میں ہم تمام وقت تقریباً روزانہ ہی فیری سے سفر کرتے نیویارک آتے جاتے رہے۔ ستمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا مگر ہماری سیاحت کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک شام نیویارک سے سٹیٹن آئی لینڈ لوٹتے ہوئے میں اور سنبل خلافِ معمول فیری کے ڈیک پہ بہت دیر کھڑے رہے۔ پیچھے ہٹتی نیویارک سٹی کی

جگمگاتی، جھلملاتی عمارتوں کوتعریفی نظروں سے دیکھتے ہم پہ ایک خاموش سا سحر طاری ہو گیا۔ نیچے گہرا نیلا ہڈسن دریا' اوپر کھلا ہوا آسمان' تیز رفتار فیری سے بننے والی جھاگ کی دودھیا جھالریں اور استقامت سے کھڑے ورلڈ سنٹر کے دو لمبوترے چوکور الف۔ سب کچھ بڑا ہی دلفریب دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت ہم یہ کہاں جانتے تھے کہ یہ نظارہ دوبارہ اس طرح سے پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹرز صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے اور باقی رہ جائیں گی کہانیاں' قیاس آرائیاں اور گرم لہو کی افسردہ مہک۔

سنبل کو فلاڈلفیا چھوڑ کر میں اور کاشف دوبارہ سیٹٹن آئی لینڈ آ گئے۔ کاشف کی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے پبلشنگ ہاؤس Donelly میں جاب ختم ہو چکی تھی لہٰذا اسے نئی ملازمت کی تلاش تھی۔ اب اس کا سٹیٹن آئی لینڈ میں رہائش رکھنے کا جواز بھی ختم ہو چکا تھا اس لے ہم نے سوچا کیوں نہ کاشف اپنے ماموں ہمایوں کے پاس بالٹی مور چلا جائے اور ان کی مدد سے گیس سٹیشن یعنی پٹرول پمپ بزنس سے نتھی ہونا سیکھے۔ یہ حقیقت ہے کہ امریکہ میں پاکستانی اور انڈین لوگ اس منافع بخش کاروبار کو بڑی تیزی سے اپنا رہے ہیں اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ کئی لوگوں نے تو اسے اپنا خاندانی کاروبار بنا لیا ہے۔ مجھے پاکستان واپس جانا تھا' سوچا اپنے بیٹے کو بالٹی مور شفٹ کروا کے ہی جاؤں گی' کہاں بے چارہ اکیلا سامان ڈھوئے گا' فلیٹ خالی کرے گا' نیا فلیٹ سیٹ کرے گا...... وغیرہ وغیرہ۔

نیو یارک کی معروف شاعرہ فرحت زاہد میری بڑی پکی سہیلی ہے۔ ان کے شوہر زاہد بھی بہت محبتی انسان اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ ساری گرمیاں وہ مجھے اپنے گھر بلانے پر اصرار کرتے رہے مگر میں اپنی بہنوں اور بچوں میں اتنی مصروف تھی کہ مجھے ان کے ہاں جانے کا موقعہ ہی نہیں مل سکا۔ اب میں کافی حد تک فارغ ہو چکی تھی لہٰذا نومبر کو میں فرحت کے ساتھ ایک دن گزارنے لانگ آئی لینڈ چلی گئی۔ بانکی فرحت اور

بنجارن میں، ہمیشہ مل کر خوب خوش ہوتی ہیں اور نیو یارک سے لے کر پاکستان تک میں ہونے والی ہر واردات کا تذکرہ کر کے گپیں لڑاتی ہیں۔ اس روز بھی ہم نے جی بھر کے باتیں کیں اور خوب ہنسے بولے۔ فرحت ایک خوبصورت شعر میں کہتی ہیں۔

تم باہر سے آئے ہو، موسم کا حال بتاؤ نا
میرے گھر کی کھڑکی میں، تو ایک ہی منظر رہتا ہے

ہم نے ادب اور بے ادب لوگوں کی بے شمار، بے ضرر قسم کی چغلیاں کیں اور پھر شام کو عنبر بیٹی مجھے آ کر اپنے گھر کوئینز لے آئی جو لانگ آئی لینڈ سے زیادہ دور نہیں ہے۔

دس ستمبر کا دن میں نے عنبر کے گھر کوئینز میں گزارا۔ عنبر کی اس دن اتفاقیہ چھٹی تھی لہٰذا ہم ماں بیٹی نے ایک دوسرے کی کمپنی سے فائدہ اٹھایا اور گھر میں آرام کیا۔ عنبر کا شوہر سروش خاموشی سے کمپیوٹر پہ بیٹھا دن رات کام کرتا رہتا ہے، اس لیے اس کے گھر ہونے نہ ہونے کا کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ وہ روایتی شوہروں کی طرح عنبر کو خوامخواہ ٹوکتا بھی نہیں لہٰذا عنبر آرام سے ہم لوگوں کو وقت دیتی ہے اور تسلی سے اپنے میکے والوں کو اٹینڈ کرتی ہے۔

گیارہ ستمبر کی صبح اٹھ کر میں نے عنبر کو بتا دیا کہ آج میں ناشتے کے بعد کاشف کے گھر سٹیٹن آئی لینڈ چلی جاؤں گی کیونکہ اب اسے شفٹ کروانے کی تیاری بھی کروانا تھی۔ عنبر کام پہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ میرے جانے کی بات سن کر خلاف توقع کہنے لگی "امی آپ آج نہ جائیں۔"

"کیوں؟ میں کیوں نہ جاؤں؟" میں حیران ہوئی کیونکہ عنبر مجھے کبھی نیو یارک میں کہیں آنے جانے سے روکتی نہیں تھی اور نہ ہی میرے کسی پروگرام میں رخنہ ڈالتی تھی۔

"بس آج آپ نہ جائیں...... میں شام کو خود ہی آپ کو چھوڑ آؤں گی۔ یا کاشی

سے کہیں، آ کر آپ کو لے جائے۔'' اس نے اصرار کیا۔

لو بھلا میں سارا دن اکیلی یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ تم دونوں میاں بیوی کام پہ جا رہے ہو۔ اب تم رات آٹھ بجے تھکی ہاری آ کر مجھے چھوڑنے جاؤ گی تو کتنی مصیبت ہو گی۔ آنے جانے میں چار گھنٹے لگ جائیں گے۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔''

''امی آپ کہاں اکیلی اتنا لمبا سفر کریں گی، پہلے یہاں سے پیدل چل کر بس سٹاپ پہ جانا، پھر ٹرین پکڑنا، دوسری ٹرین بدلنا، ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے فیری میں سوار ہونا، اس کے بعد اتر کر پھر بس لینا۔ مشکل ہو گی نا آپ کے لیے۔'' میری بچی فکرمندی سے بولی۔

''عنبری جان، میری بچی، میں کیا کبھی پہلے نہیں گئی۔ رُل کھل کے چلی ہی جاؤں گی نا۔''

ڈونٹ وری بے بی...... میں کر لوں گی۔ تم آرام سے آفس جاؤ اور میری فکر نہ کرو۔'' میں ہمیشہ کی مرد مجاہد ہوں، مجھے اپنی بچی کی پریشانی پہ پیار آ گیا۔ سوچا چلی جائے گی تو میں بھی روانہ ہو جاؤں گی۔ گھر کی ڈپلیکیٹ چابی میری پاس تھی۔

عنبر خاموشی سے دفتر چلی گئی اور میں نے جلدی جلدی ناشتہ کر کے نکلنے کی ٹھانی۔ میں کچھ حیران ہو رہی تھی کیونکہ عنبر جانتی تھی میں اپنے بچوں سے خوامخواہ کی ڈیوٹیاں کبھی نہیں لیتی۔ حد سے زیادہ کوشش کرتی ہوں کہ کوئی مجھے لینے چھوڑنے نہ آئے، میں خود ہی اپنے آنے جانے کا بندوبست کروں۔ میرے پیارے بچے پہلے ہی امریکہ میں کونسا سُکھ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پاکستان میں نوکروں اور ماں باپ کے لاڈ پیار کے پلے ہوئے شہزادے شہزادیاں اب امریکہ کی آدم منڈی میں محنت کش چوہوں کی طرح بھاگتے بھاگتے صبح سے شام کر دیتے ہیں اور ایک پل بھی آرام نہیں کرتے۔ پھر کوئی بھی بچہ مجھے چھوڑنے یا لینے جاتا تو اسے ویرازانو پل کراس کرنے

کے سات ڈالر ٹول ٹیکس دینا پڑتا۔ میں یہ بوجھ ان پہ کیوں ڈالتی؟ لہٰذا میں گھر سے نکلی اور لوکل بس سٹیشن سے ٹرین سٹیشن لے جانے والی بس میں سوار ہو گئی۔

میری ساتھ والی نشست پہ بیٹھی ایک گوری چٹی خوبصورت خاتون نے مجھ سے خود ہی بات چیت کرنا شروع کر دی اور چند ہی لمحوں میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ خواتین کے درمیان بہناپا بڑی جلدی قائم ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق پولینڈ سے ہے اور وہ کئی گھروں میں ہیلتھ کیئر ورکر کے طور پر کام کرنے جاتی ہے۔

''مگر میری جاب کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔'' اس نے شرارت سے آنکھ ماری۔

''وہ کیا؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا بے کار میاں، سارا دن گھر بیٹھا رہتا ہے۔ ہر وقت لڑتا ہے۔ زہر لگتا ہے مجھے۔ میں تو اس کے مرنے کی دعائیں مانگتی ہوں تا کہ میں بھی زندگی کا لطف اٹھا سکوں۔''

''ہیں؟ وہ اگر اتنا ہی برا لگتا ہے تو چھوڑ دو اسے۔'' میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ بھلا مغرب کی عورت کو ایسی زبردستی کی زندگی گزارنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کیا کروں میرے بچے۔''

''لیکن وہ تو اب جوان ہوں گے۔'' میں نے اس کی عمر سے اندازہ لگایا۔''

''ہاں، لیکن وہ کہتے ہیں ماں اسے نہ چھوڑنا۔ اب یہ کہاں جائے گا۔ بس بچوں کی بات کا پاس رکھے ہوئے میں اس مصیبت کے ساتھ گزارا کرنے پہ مجبور ہوں۔'' اس نے اپنا دکھڑا سنا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ عورت اور اس کی تقدیر ساری دنیا میں ایک ہی جیسی

ہوتی ہے۔ جب وہ ماں ہوتی ہے تو ممتا کا جذبہ ہر جذبے پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ مجھے لگا جیسے وہاں گوری چٹی، پینٹ شرٹ میں ملبوس، کٹے ہوئے بالوں والی پولش عورت کی جگہ کوئی میرے دیس کی معاشرتی طور پر پسی ہوئی عورت بیٹھی ہے۔ ان دونوں عورتوں کے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیریں ایک ہی جیسے رنگ اور وزن کی ہیں جنہیں وہ چاہیں بھی تو آسانی سے توڑ نہیں سکتیں۔

میں نے اپنی بیٹی عنبر کے بارے میں سوچا تو مجھے اس پہ پیار آنے لگا۔ خوامخواہ ہی میرے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ بس Q.35 نے ہمیں کانٹی نینٹل ایونیو اتارا تو میں جلدی سے اتر گئی۔ عنبر نے اترنے کے لیے یہی سٹیشن بتایا ہوا تھا، دوسرے سٹیشنوں پہ اترنے سے وہ ہمیشہ منع کرتی تھی کیونکہ وہاں کالے اور نشئی بہت ہوتے ہیں اور عنبر کو میری بہت فکر رہتی ہے۔

سب وے ٹرین سٹیشن کے نیچے سیڑھیاں اتر کر میں نے جلدی سے ایف ٹرین لی اور صبح سویرے کے رش آور میں، میں بھی لوگوں کے ساتھ ہچکولے لینے لگی۔ شکر ہے کہ ٹرین ایکسپریس تھی اس لیے کئی سٹیشن پھلانگتی ہوئی وہ Lexington ایونیو پہ پہنچ گئی جہاں سے دوسری ٹرین لے کر مجھے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے سامنے واقع فیری ٹرمینل سے فیری لے کر سٹیٹن آئی لینڈ جانا تھا۔

ساؤتھ فیری ٹرمینل سے ابھی ہم دو سٹاپ پیچھے کنال سٹریٹ سٹاپ پہ ہی پہنچے تھے کہ یکدم ٹرین کو زور سے بریک لگی اور مسافر رش کی وجہ سے ایک دوسرے کے اوپر جا گرے۔ ''او مائی گاڈ'' ''آئی ایم سوری، کیا ہوا؟'' اور میرے منہ سے نکلا ہوا ''یا الٰہی خیر'' سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کہیں ٹرین ہائی جیک تو نہیں ہو گئی۔ مجھے یکدم فلمی سا خیال آیا کیونکہ فلموں میں ایسا بہت دیکھ رکھا تھا۔ چلتی ٹرین ایک دم ساکت ہو گئی۔ فضا میں کچھ لوگوں کی چیخیں ابھی تک تیر رہی تھیں۔

پتہ نہیں کیا ہونے والا تھا......؟ باہر پلیٹ فارم گھپ اندھیرے میں خاموش پڑا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد نیویارک میٹروٹرانزٹ کا ایک گارڈ ٹارچ لائٹ ہاتھ میں تھامے باہر کھڑا نظر آیا اور آٹومیٹک دروازے جادوئی طور پہ کھل گئے۔ اس نے لوگوں کو باہر آنے کا اشارہ کیا' تو مسافر نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔ گارڈ نے ہمیں بتایا کہ ہم لوگ پلیٹ فارم سے اوپر کی سیڑھیاں چڑھ کر باہر نہیں جا سکتے کیونکہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ کیا گڑبڑ ہے؟ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ یہ غالباً وہی وقت تھا جب پہلا طیارہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت سے ٹکرا رہا تھا اور ساری دنیا میں ایک قیامت مچنے والی تھی۔ کوہ قامت عمارات میں آگ اور خون کا خوفناک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ پگھلا ہوا سٹیل سیال مادہ بن کر کسی کی رگوں میں اتر رہا تھا اور کھڑکیوں کے چٹختے ہوئے شیشے کسی نرم و گداز جسم میں گھس کر کرچی کرچی ہو رہے تھے۔

ہم اس وقت کہاں جانتے تھے کہ چند دیوانوں نے ان ٹاورز کی مضبوط بنیادوں کو اتنی زور سے ہلا کر رکھ دیا ہے کہ اس کی دھمک امریکہ اور دور دراز دیسوں کے رہنے والوں کی زندگیوں اور معیشتوں میں ایک عرصے تک سنی جاتی رہے گی۔ تباہی کا بادل اس زور سے گرجے گا کہ دھرتی کانپ اٹھے گی اور آسمانی دیوتا حیرت و استعجاب میں ڈوب جائیں گے۔

پلیٹ فارم پر اندھیرے میں اندر ہی اندر چلتے چلتے ہم بالآخر ساؤتھ فیری ٹرمینل کے سٹیشن تک جا پہنچے جہاں سے سیڑھیاں چڑھ کر ہم سب کو اوپر جانا تھا۔ بوکھلائے ہوئے مسافر سراسیمگی کے عالم میں اوپر چڑھتے چلے گئے اور باہر کھلے آسمان تلے جا کر کھڑے ہو گئے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹرز میری آنکھوں کے بالکل سامنے تھے' جو کچھ میں نے دیکھا اسے دیکھ کر میرا جسم پتّے کی طرح کانپا اور آنکھیں خوف سے چر گئیں۔ دو او نچے

اونچے پربتوں میں الاؤ دہک رہے تھے اور حشر کا سا سماں تھا۔ ایک بلڈنگ میں آگ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ایک لمبوترے چوکور کیک میں سرخ نارنجی کریم کی فلنگ بچھا دی گئی ہو۔ دوسری دھوئیں کا غلاف پہنے مبہوت کھڑی تھی کہ دنیا کی سب سے طاقتور اور اہم عمارتوں کے ساتھ یہ سلوک کس نے اور کیسے کیا؟......اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹاور نیچے کو آنے لگا اور آتے آتے اتنا نیچے آ گیا کہ سفید گرد کے غبار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لوگوں کی چیخ پکار اور آہ و بکا سن کر لگتا تھا جیسے یہ کسی فلم کا سین ہو حقیقت نہ ہو۔ بعد میں ہالی وڈ کے ایک ڈائریکٹر نے یہ کہا تھا کہ اگر ہالی وڈ بھی چاہتا تو اتنا پرفیکٹ تباہی کا پروگرام نہ سوچ سکتا، نہ لکھ سکتا اور نہ فلما سکتا تھا۔

فیری سٹیشن ٹرمینل بالکل سامنے ہی تھا۔ اس پر سے اترنے والے لوگ یوں دھیرے دھیرے فیری سے اتر کر آ رہے تھے جیسے وہ کٹھ پتلیاں ہوں، ان کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی اور آنکھوں میں پتھر کے ڈیلے ہوں۔ میں بھی دم بخود کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ یکدم مجھے خیال آیا۔ اوہ میرے خدا تو نے میرے بچے کاشف کو بچا لیا۔ تیرا شکریہ۔ میں وہیں زمین پر ڈھیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میرا کاشف بھی تو صبح کی شفٹ میں وہیں کام کیا کرتا تھا۔ اگر خدانخواستہ وہ بھی...... آگے سوچنے سے میرے دل نے انکار کر دیا مگر اسی وقت مجھے ان سب ماؤں کا بھی خیال آ گیا جن کے بچے وہاں جل بھن رہے تھے۔ ان کی بھی وہاں یوں مرنے کا بھلا کیا تُک تھی؟ وہ بھی تو کسی کے بچے ہی تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ۱۹۹۳ء میں بھی جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے نیچے پارکنگ لاٹ میں بم رکھ کر اسے اڑانے کی کوشش کی گئی تھی تو میرا بچہ کاشف اس کے کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نیویارک سے نیوجرسی جانے والی ہالینڈ Tunnel میں گھنٹوں بلاک شدہ ٹریفک میں کھڑا رہا تھا کیونکہ دونوں طرف کے راستے بند کر دیے گئے تھے۔

ہم مسافر باہر کی بھگدڑ سے خوفزدہ ہو کر پھر نیچے اتر گئے اور اندھیرے پلیٹ فارموں پہ اندر ہی اندر پیدل چلنے لگے۔ٹرانزٹ والوں نے بتایا کہ ہمیں اس ایریا سے دور جا کر کوئینز واپس جانے کے لیے ٹرین شاید مل سکے کیونکہ مین ہٹن اور سٹیٹن آئی لینڈ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اور ایک انڈین ہم سفر عورت آپس میں بات چیت کرتے' دعائیں مانگتے چلتے چلے گئے۔تقریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہم کوئینز میں باہر نکلے اور کچھ سکھ کا سانس لیا۔

کوئینز پہنچتے ہی میں نے عنبر کو پے فون سے فون کر دیا۔ وہ بھی دفتر سے چھٹی ہوتے ہی سیدھی گھر چلی آئی تھی۔ اس نے مجھے ٹرین سٹیشن سے پک کر لیا اور ہم جلدی جلدی سیڑھیاں چل کر اس کے اپارٹمنٹ کے اندر چلے گئے۔ ''شکر ہے امی آپ خیریت سے آ گئیں۔ ہم لوگ تو بڑے پریشان تھے کہ آپ کہیں پھنس نہ جائیں۔'' بیٹی نے میرے گلے سے لگ کر کہا۔ اب تک میرا داماد سروش بھی گھر واپس آ چکا تھا اور ہم نے جلدی جلدی نیو یارک میں اپنے عزیز و اقارب کو فون کر کے ان کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ٹیلی فون سسٹم ڈاؤن تھا' اور امریکہ میں ٹیلی فون کا خراب ہونا ایک عجیب وغریب بات تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ ہم سب بار بار ایک دوسرے کے صحیح سلامت ہونے اور کاشف کے وہاں موجود نہ ہونے پہ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے اور ساری دنیا کی طرح یہی سوچے جا رہے تھے کہ آخر ہوا کیا ہے؟ امریکہ میں پاکستان کی طرح چھتوں پر چڑھنے کا رواج نہیں مگر اس روز میں اور عنبر اس کی بلڈنگ کی چھت پہ خاص طور پر چڑھے اور دیکھا۔ مین ہٹن کی سمت سے اٹھنے والا دھواں اور سفید غبار صاف دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب نظارہ تھا۔

☆☆

مجھے مین ہٹن میں رہنے والے اپنے کزن شکوہ کا خیال آ گیا' نہ جانے وہ کہاں ہو گا؟ اللہ کرے خیریت سے ہو' میرا ل ڈرنے لگا اور میں نے اسے فون کرنے کی کوشش کی مگر اس روز امریکن فون بالکل پاکستانی فون بنے ہوئے تھے۔ مستقلاً انگیج ٹون آ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے شام تک کہیں جا کر اس کی بیوی مریم سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں خیریت سے ہیں۔ شکوہ صبح تیار ہو کر اپنے آفس جا چکا تھا اور مریم ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ایک آفس میں جاب انٹرویو کے لیے گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ یہ سب ہو گیا۔ شکوہ نے فوراً مریم کو موبائل فون پہ بتا دیا کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے اور وہ گھر پہ ہی رک گئی۔ اگر یہ واقعہ صبح نو بجے کے بعد پیش آیا ہوتا تو سبھی لوگ دفتر آ چکے ہوتے مگر ابھی چونکہ نو بجنے میں دس گیارہ منٹ باقی رہتے تھے لہٰذا کچھ بچت ہو گئی۔ اس وقت تقریباً تیس ہزار کے قریب لوگ بلڈنگوں میں تھے۔ جانی نقصان چار ہزار لوگوں کا ہوا اور بلڈنگوں میں موجود تین لاکھ خالی کرسیاں بیٹھنے والوں کے انتظار میں چورا چورا ہو گئیں۔

شکوہ سے بات ہوتی تو اس نے بڑی نقاہت سے بولتے ہوئے بتایا کہ دھماکے کے فوراً بعد چونکہ سبھی آفس وغیرہ بند ہو گئے تھے وہ بھی گھر کو چل دیا۔ سڑک پہ ٹیکسی' کار' بس' کچھ بھی نہیں چل رہا تھا اس لیے اسے پانچ گھنٹے مسلسل پیدل چلنا پڑا تب کہیں جا کر وہ گھر پہنچا۔ اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں اور جسم چور چور۔ اس لیے میں نے اس سے زیادہ بات نہیں کی اور آرام کرنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

گیارہ ستمبر کا سارا دن سبھی نے ٹی وی کے آگے گزارا۔ میں عنبر کے گھر بیٹھی تھی اور

WE WILL NEVER FORGET

ہم کبھی نہ بھولیں گے
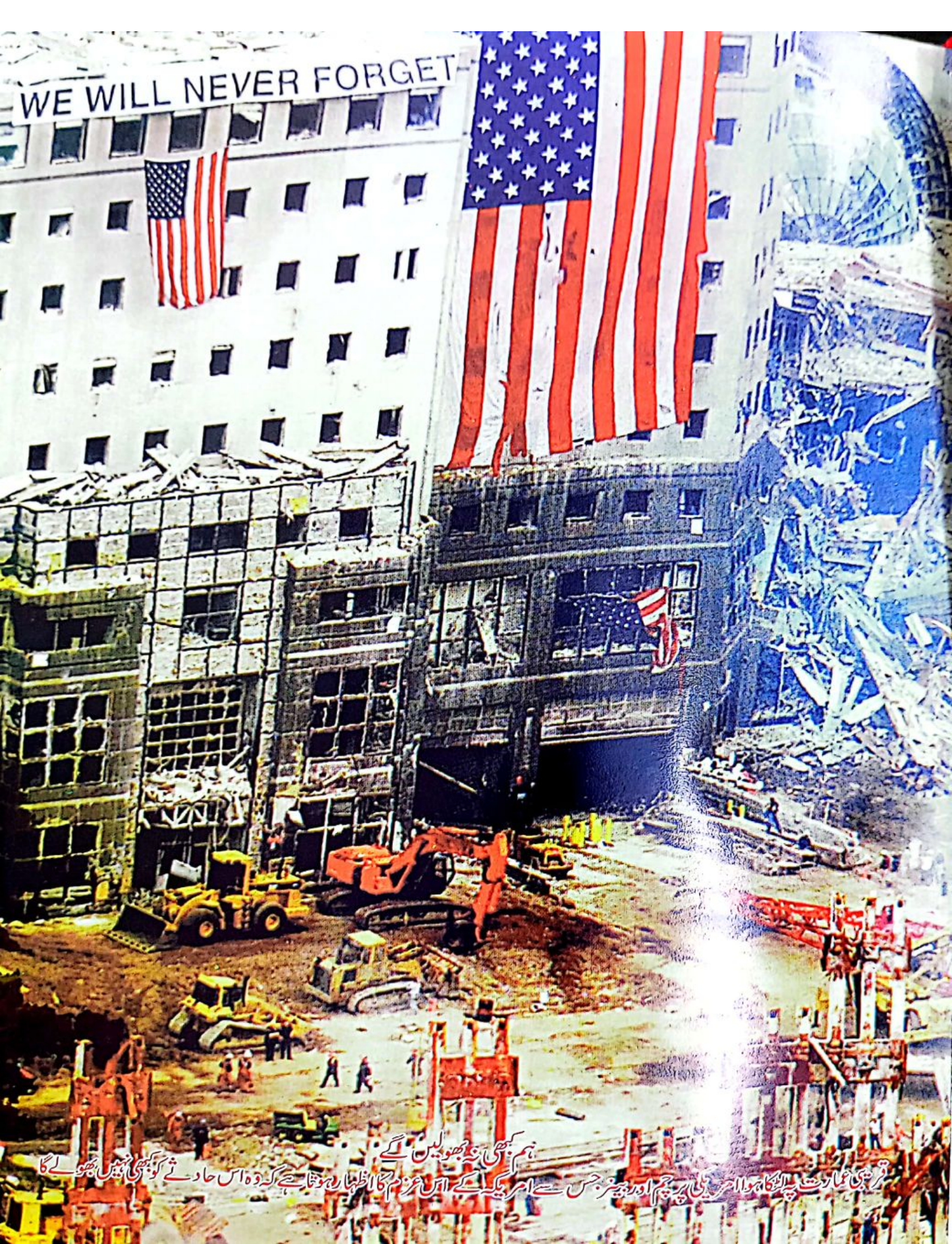
قریبی عمارت پہ لٹکا ہوا امریکی پرچم اور بینر جس سے امریکہ کے اس عزم کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اس حادثے کو کبھی نہیں بھولے گا

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ
پس منظر میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر جل رہا ہے

شام کے تقریباً پانچ بج چکے تھے۔اس وقت تک ٹی وی پہ ایک دو ہائی جیکرز کے نام اور تصاویر آ چکی تھیں اور مسلمانوں پہ الزام لگنا شروع ہو چکا تھا۔ میرا دل گھبرا گیا اور میں نے عنبر سے کہا ''چلو ذرا باہر واک کر کے آتے ہیں۔'' وہ مان گئی اور ہم دونوں ماں بیٹی اسی طرح جیسے گھر میں بیٹھی تھیں نیچے گلی میں اتر گئیں۔اس وقت ہم نے معمول کے مطابق شلوار قمیض پہن رکھی تھی مگر دوپٹے گلوں سے غائب تھے۔عنبر کے اپارٹمنٹ کا رہائشی علاقہ بہت پُرسکون اور محفوظ سمجھا جاتا ہے اس لیے آپ آرام سے ادھر ادھر گھومیں تو آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ہم دونوں گلی سے نکل کر مین سڑک پہ آ گئیں مگر یکدم مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ایسا لگا جیسے اُس سڑک' اس محلے' اس پورے شہر میں شاید صرف ہم دو ذی روح ہی تھے جو اس وقت گھر سے باہر تھے۔دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔تمام کاریں گھروں کے آگے سلیقے سے یوں پارک تھیں جیسے کسی نے انہیں سجا کر رکھ دیا ہو۔ہر گھر سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

تھوڑا سا آگے چلنے پر ہم نے دو تین پولیس والے کھڑے دیکھے۔ہم حسب معمول بڑے اعتماد کے ساتھ ان کے آگے سے گزرے لیکن ان کی ایک ہی نظر نے ہمیں سیلف کانشس کر دیا۔ ہمارا لباس انہیں بتا رہا تھا کہ ہم ہائی جیکرز کے قبیلے کی عورتیں تھیں جو اس وقت اچانک ان کے لیے دشمن بن چکی تھیں۔پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہمیں شاید شلوار قمیض پہن کر باہر نہیں آنا چاہیے تھا حالانکہ عنبر تو ہر وقت شلوار قمیض میں گھومتی تھی۔ویسے ہی سٹورز سے سودا لاتی' کبھی جھجکتی نہ تھی۔

ہم دونوں جلدی سے کارنر ڈونٹ کافی شاپ میں گھس گئیں۔کاؤنٹر پہ کھڑی انڈین لڑکی نے سہمی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھا۔کافی شاپ بالکل خالی تھی۔ہم نے ایک ایک ڈونٹ اور کافی لی۔

''اور ڈونٹ لے لیں بلکہ سارے ڈونٹ لے لیں۔'' اس نے ہماری طرف

دیکھا۔

''کیوں؟ ہم نے ایک ایک لے تو لیا ہے۔''میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیونکہ صبح سے کوئی آیا ہی نہیں۔اب میں شاپ بند کرنے والی ہوں اور قاعدے کے مطابق مجھے آج کے نہ بکنے والے ڈونٹ کوڑے دان میں پھینک کر ہی جانا ہوں گے۔''وہ دھیمے انداز میں بولی۔

''نو تھینکس ہمیں اور نہیں چاہیے۔'' میں نے شکریہ کہہ کر انکار کر دیا۔ دل میں افسوس کی ایک بڑی سی لہر اٹھی۔''ہائے ہائے ہمارے غریب ملکوں کے لوگ خوراک کو ترستے ہیں اور اس امریکہ میں اتنی صاف ستھری، خالص، مزیدار کھانے کی چیزیں کوڑے کی نظر ہو جاتی ہیں۔سچ ہے امریکہ کو اللہ نے بہت نوازا ہے۔''

ہم پھر گھر کو لوٹ گئے۔گھر جا کر بھی سوائے ٹی وی دیکھنے کے اور کسی چیز میں جی ہی نہیں لگ رہا تھا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے پھر ٹی وی کو گھورنے بیٹھ گئے۔ایک عجیب منظر نظر آیا، تو میں چونک گئی۔ نیویارک سٹی کے تمام خوبصورت، خوابوں کے جھولوں جیسے پُل ٹریفک کے لیے مکمل طور پر بند کر دیے گئے تھے۔خبر ملی تھی کہ پُلوں کے نیچے ایسے آتش گیر مادے کی موجودگی کا امکان ہے جس سے پُلوں کی آہنی رسیاں کسی بھی وقت ٹوٹ کر انہیں دریا برد کر سکتی ہیں۔ یہ بھی دیکھا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے سے بچ جانے والے سفید دھول میں اٹے کپڑوں میں ملبوس لوگ، خاموش، ننگے پیر، بُت بنے، چہروں پہ خوف کے رنگ سجائے، چپ چاپ پیدل چلے جا رہے ہیں۔یوں جیسے ان کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہو اور ذہن کسی بھی قسم کا ادراک کرنے سے قاصر ہو۔ جیسے وہ کسی سائنس فکشن فلم کے مشینی روبوٹ کا کردار ہوں، انسان نہ ہوں۔

مجھے اپنی بیٹی عنبر کا خواب یاد آ گیا۔یہی تو اس نے دیکھا تھا اور مجھے کئی روز پہلے

پُل پر راہگیر

حادثے سے بچ نکلنے والے نیویارک پیدل پُل کراس کر رہے ہیں

یہ دھواں سا

مین ہٹن سکائی لائن دھوئیں کی لپیٹ میں

سنایا بھی تھا۔ میں حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگی کئی بار کیسی عجیب عجیب باتیں ہو جاتی ہیں جن کا بظاہر کوئی مقصد یا تک نہیں ہوتی اور نہ ہی ہم ان کے ہونے کی منطق کو سمجھ سکتے ہیں مگر وہ ہو جاتی ہیں۔ عنبر نے پہلے ہی وہ منظر نہ جانے کیسے دیکھ لیا تھا۔ ویسے عنبر نے پہلے بھی دو ایک بار کچھ سچ ہو جانے والے خواب دیکھے تھے اور ہم سب سوچتے رہ گئے تھے کہ یہ سب کیا تھا؟

اس روز نیویارک سٹی مکمل طور پر شٹ ڈاؤن ہو گئی تھی۔ فلائٹیں بسیں ٹرینیں سبھی کچھ بند ہو گیا تھا۔ ایک ہنستا مسکراتا چہکتا بہکتا شہر شہر وحشت اور افسردہ نگری بن چکا تھا۔ نہ جانے کیا ہو چکا تھا اور کیا ہونے والا تھا۔ ٹی وی کے سبھی چینل بس وہی خوفناک منظر دکھاتے چلے جا رہے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہم مسمرائز ہوئے بس دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ دونوں طیاروں کا ٹاورز سے ٹکرانا اور پھر ان دیوہیکل عمارات کا کمزوری سے لڑکھڑا کر گرنا اور بعد کے مناظر ذہن کے پردے پہ ہمیشہ کے لیے نقش ہو کر رہ گئے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹرز میں قائم کئی دفاتر کے کروڑوں سفید کاغذیوں اڑ کر فضا میں تیر رہے تھے جیسے مرے ہوئے پتنگے ہوں۔ شیشے چیخ رہے تھے اور کسی کھڑکی میں کوئی انسان سفید کپڑا ہلا کر مدد کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔ کئی لوگوں نے پگھلے ہوئے سٹیل اور بھڑکتی ہوئی آگ سے بچنے کے لیے سو منزلہ عمارت سے چھلانگیں لگانے کو ترجیح دی۔ ایک مرد عورت ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نیچے کود ے یوں جیسے گرم ریت بھری کڑاہی میں بھنتی ہوئی مکئی کے دانے پھول بن کر باہر جا گرتے ہیں۔

مجھے اس روز پھر یقین ہو گیا۔ محبت ایک لافانی جذبہ ہے جو کبھی مرے گا نہیں اس دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہی اس دنیا کی سجاوٹ ہے اس کا ہار سنگھار ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے خوف اور تباہی بے سکونی اور بے چینی ہے۔ موت ایک وحشی چڑیل کی طرح ان گلیوں میں رقصاں تھی جہاں کبھی زندہ لوگ چلتے پھرتے تھے۔ ایک منحوس

بے بسی اور سفید گرد کے بادل کا عفریت' جان بچا کر بھاگنے والوں کے تعاقب میں تھا۔سب کے لبوں پہ ایک ہی پکار تھی ''اوہ مائی گاڈ۔'' اوہ مائی گاڈ۔'' اسی اللہ اور گاڈ کو پکارا جارہا تھا جس کے ماننے والے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے اور نفرت جن کا مسلک تھی۔

نیویارک کے زیادہ تر فائر مین اس وقت وہاں پھنسے ہوئے لوگوں کو نکالنے کے لیے پہنچ چکے تھے اس لیے جب عمارتیں گریں ان کی ایک بڑی تعداد اس جناتی اجتماعی قبر میں دفن ہوگئی۔صبح کے نو بجے تھے مگر یوں اندھیرا ہوگیا جیسے رات رستہ بھول کر ادھر آ نکلی ہو۔آسمان پر محافظ جہاز اڑتے نظر آنے لگے لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

سڑک پہ کھڑے لوگ' کیمرے سے تصاویر کھینچنے والے' بچ جانے والے سبھی رو رہے تھے اور گرتے پڑتے بھی ایک دوسرے کی مدد کرتے نظر آ رہے تھے۔بھگڈر میں بھی انسان نے انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا حالانکہ سفید دھواں ان کے سانس میں شامل ہوکر انہیں بے حال کیے دے رہا تھا۔ٹی وی پہ آنے والے اعداد وشمار کے مطابق دس ہزار گیلن جیٹ فیول کی وجہ سے دو ہزار ڈگری درجہ حرات کی آگ نے تین بلین پاؤنڈ کے سٹیل کو پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ایسے میں نرم و نازک' گوشت پوست کے بنے ہوئے انسانوں کے جسم یہ سب کیسے سہار سکتے تھے؟ کانچ کے کھلونوں نے تو ٹوٹ ہی جانا تھا اور کانچ کے ذرّوں کو ملبے سے چھاننا ایک ناممکن عمل تھا۔سبھی ریزہ ریزہ ہوگئے تھے۔

تراسی ملکوں کے لوگ' مختلف مذاہب کے پیروکار' سوئے تو اکھٹے سو گئے۔مٹی میں مٹی ہوئے تو مٹی کا ہی رنگ اختیار کیا اور ان کے جسموں کے ریزوں نے ایک دوسرے میں مدغم ہوجانے پر کوئی بھی اعتراض نہ کیا۔

ٹاورز گرنے سے پہلے ان میں پھنسے ہوئے لوگوں کو جب یقین ہو گیا کہ وہ موت

کے خونی پنجے سے نجات نہیں حاصل کر سکیں گے تو انھوں نے اپنے پیاروں کو اپنے اپنے موبائل ٹیلی فونوں سے آخری کالیں کرنا شروع کر دیں۔ زیادہ تر نے یہی بات کی کہ ''میں اس وقت فلاں منزل پہ trap ہو چکا (پھنس چکا) ہوں۔ آپ پریشان نہ ہونا اور یہ یاد رکھنا کہ I Love you ۔'' کسی نے اپنی بیوی، ماں، بچوں اور کسی نے اپنے شوہر، باپ، بھائی کو ایسا پیغام دیا جو وائس میل میں ریکارڈ ہو کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ محبت کتنا عظیم، اہم اور طاقتور جذبہ ہے کہ انسان زندگی کے آخری لمحات میں بھی، لب پہ اسی کا ذکر لیے رخصت ہونا چاہتا ہے۔ اسی کی یاد کی خوشبو، دلوں میں چھوڑ جانا چاہتا ہے۔

نیویارک کے ہر دلعزیز میئر جولیانی صاحب کو جیسے ہی اس حادثے کی خبر ملی وہ اپنے سٹاف سمیت فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گئے ۔ حالات کا جائزہ لیا اور ضروری اقدامات کی ہدایت دیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کی سٹاف ورکر نینسی بھی چل رہی تھی اور اپنے باس کی ہر ہدایت کو نوٹ کرواتی جا رہی تھی۔ یکا یک میئر جولیانی کو کوئی خیال آیا، انھوں نے ایک دم گردن موڑ کر نینسی کو دیکھا اور سوالیہ نظروں سے پوچھا ''نینسی تمہارا شوہر ایڈی کہاں ہے؟'' فائر مین ایڈی کی بیوی کی آنکھوں میں سمندر امڈ آیا۔ ''کیا وہ؟'' میئر نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔ اس وقت تک دونوں ٹاورز زمین بوس ہو چکے تھے۔

ایڈی کو کال آئی تو وہ فوراً ہی چلا گیا تھا۔'' نینسی نے گلوگیر آواز میں بتایا۔

''تو تم! تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' میئر نے اسے گلے سے لگا لیا۔'' میرے کلیجے سے اٹھنے والی ٹیس نے مجھے بتا دیا ہے کہ ایڈی اب نہیں رہا۔'' نینسی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔'' وہ یقیناً لوگوں کی مدد کرتے ہوئے ہی گیا ہو گیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔'' میئر نے نینسی کو زبردستی چھٹی دے کر گھر بھیج دیا۔ نینسی کی کوکھ

میں اس کا پہلا بچہ سانس لے رہا تھا جس کا باپ اس سے ملے بغیر ہی اس دنیا سے روانہ ہو چکا تھا۔

میئر جولیانی نے اپنی پریس کانفرنس کی تقریر میں اطالوی شاعر "دانتے الغیری کی طویل کلاسیکی نظم Divine Comedy کا حوالہ دیا جس میں قیامت اور دوزخ کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے سانحۂ نیویارک کو دانتے کی قیامت کی بعینہ تصویر قرار دیتے ہوئے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی آگ کو دوزخ کی دہکتی آگ سے مشابہ قرار دیا۔

اس نظم میں دانتے اپنے ساتھی درجل کے ساتھ دوزخ کی سیر کرتے ہوئے مختلف مقامات آہ وفغاں سے گزرتا ہے وہ۔ "city of grief" دکھ کے شہر کی زمین پہ خوف اور کرب سے بگڑے بے ہیئت چہرے بچھے ہوئے دیکھتا ہے جن کا تعلق دنیا کے ہر ملک اور مذہب سے ہے دانتے کہتا ہے:

All Those who perish in the wrath of God
Here meet together out of every land

عجیب بات تھی کہ واقعی دانتے کی نظم کی طرح یہاں بھی اس سانحہ اور اس آفت میں اکھٹے آن ملنے والے لوگوں کا تعلق دنیا کے ہر ملک اور قوم سے تھا۔ ان سب کے چہرے اور جسم ایک ہی مٹی میں گھل مل گئے تھے اور ایک ہو گئے تھے۔ دوسو کے قریب تو صرف پاکستانی ہی تھے۔ جن میں سے کئی کی کہانیاں سننے کو ملیں تو دل ہزار ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔

ایک پاکستانی اس روز آفس پہنچنے میں لیٹ ہو گیا کیونکہ اس کی بچی نے خلاف توقع ضد پکڑ لی کہ "آج ابو ہی مجھے سکول ڈراپ کریں گے میں بس میں نہیں جاؤں گی۔" بیٹی کی بات کو باپ ٹال نہ سکا اور یوں اس تباہ کن گھڑی سے بچنے میں کامیاب ہو گیا

بدنما گڑھا

شاہانہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت کی جگہ مجسم شدہ گہرا بدنما گڑھا دیکھنے والوں کا منہ چڑا رہا تھا

میموریل لائیٹس

مرنے والوں کی یاد میں ورلڈ ٹریڈ سینٹرز کی خالی جگہوں پر جلائی گئیں نیلی لیزر لائیٹس ماحول کو پراسرار بنا رہی تھیں

جس کا وہ بھی با آسانی شکار ہو سکتا تھا۔ اللہ کی مرضی کچھ یوں ہی تھی۔

بہت برس گزرے پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں ایک جہاز جسے ایک جواں سال پائلٹ اڑا رہا تھا گر کر لاپتہ ہو گیا تھا۔ پائلٹ اپنی تین ماہ کی بیاہتا بیوی کی منتظر آنکھوں میں سپنوں کے دیے جلتے چھوڑ آیا تھا مگر افسوس کہ وہ واپس نہ جا سکا اور اس کی بیوی اپنی نظریں دروازے پہ ٹکائے اس کا انتظار کرتی رہ گئی۔ اس کی زندگی سے بہاریں روٹھ گئیں مگر جب اس کے آنگن میں ایک پھول کھلا تو اس نے اس کی خوشبو سے اپنی زندگی معطر کر لی اور یوں زندگی میں دوبارہ مصروف ہو گئی۔ اس کا بیٹا جوان ہو کر امریکہ چلا گیا اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے کسی آفس میں جاب کرنے لگا۔ گیارہ ستمبر کی خوبصورت صبح کو جب نیلے نیلے آسمان پہ بادل کا کوئی بھی ٹکڑا موجود نہ تھا' وہ پاکستان میں اپنی پیاری ماں سے ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا۔ یکا یک اس نے کہا ''امی جی کوئی دھما کا ہوا ہے۔'' اور پھر لائن کٹ گئی۔ ہمیشہ کے لیے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا کبھی دوبارہ جاری نہ ہونے کے لیے......

مشہور پاکستانی پاپ سنگر جنون گروپ کے گٹارسٹ اور کمپوزر سلمان احمد کے والد اعجاز احمد صاحب نیویارک کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی ایک دوست فیملی کے جواں سال اکلوتے بیٹے تیمور بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ٹریڈنگ کا کام کرتے تھے۔ حادثہ کے بعد تیمور کا ایک عرصے تک کوئی سراغ نہ ملا مگر ان کی والدہ محترمہ طاہرہ کسی طرح بھی یہ حقیقت قبول کرنے کو تیار نہ تھیں کہ ان کا لاڈلا اب انہیں کبھی دکھائی نہیں دے گا۔ انہیں امید تھی کہ تیمور زندہ ہو گا اور ایک دن کہیں نہ کہیں سے اپنا ہنستا مسکراتا چہرہ لیے نکل آئے گا۔ انھوں نے نیویارک میں اپنے گھر کئی بار میلاد کروایا۔ بزرگوں سے رابطے کیے اور اس کے زندہ مل جانے کی دعائیں منگوائیں' انھوں نے بیٹے کے دوستوں کو منع کر دیا کہ ان کے بیٹے کو مردہ نہ سمجھیں۔ لوگ انہیں سمجھانے کی کوشش

کرتے تو وہ کہتیں ''جب تک اس کا کوئی نشان نہ ملے، میں کیسے سمجھ لوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' ایک ماں کا اپنی اولاد کے لیے ایسا سوچنا کتنی مشکل بات ہے، یہ ایک ماں ہی جان سکتی ہے۔ حادثے کے بہت سارے دن گزر جانے کے بعد ملبہ اٹھانے والے ایک ایسے مقام پہ جا پہنچے جہاں سیڑھیوں کے نیچے کچھ لوگ سو رہے تھے اور ان کے جسم منتشر نہیں ہوئے تھے۔ تیمور وہیں تھا۔ شاید اس کی ماں سے بھی زیادہ خدا کو اس کی ضرورت تھی۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ریستورانوں' کیفے' میں کام کرنے والے بہت سے بنگلہ دیشی ویٹر اور بیسمنٹ میں ناشتہ کے Bagels بیچنے والی جوان بنگالی ماں جس کی ننھی بچی گھر پہ تھی ہونے سے نا ہونے کی منزلیں طے کر چکے تھے۔ کیا ان میں سے کسی کا بھی کوئی قصور تھا؟ ان محنت کشوں کو زہر کا پیالہ کیوں پینا پڑا؟ پتہ نہیں' وہ ظالموں میں سے تھے یا مظلوموں سے' کچھ خبر نہیں۔ اور وہ بارہ تیرہ سالہ امریکن بچی میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتی جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے آگے کھڑی ہوئی مستقل چیخے جا رہی تھی I want my mommy۔ اس کی ماں بھی اسی عمارت میں نوکری کرتی تھی اور لا پتہ ہو چکی تھی۔

لا پتہ افراد کے عزیز و اقارب کتنے ہی دنوں تک اپنے پیاروں کی تصویریں ہاتھوں میں تھامے فلموں کی طرح' ہر ایک سے سوال کرتے ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے؟ کیا آپ کو اس کے بارے میں کوئی علم ہے؟'' افراتفری میں جو لوگ زندہ یا زخمی ملے انہیں فوراً ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہسپتالوں میں بھیج دیا گیا یہ معلوم کیے بغیر کہ وہ کون ہیں جانتے ہوئے کہ گھر والے انہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے اس لیے کئی لوگوں کا بہت عرصے تک پتہ ہی نہ چل سکا کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ۔ ملبے میں سے انسانی جسموں کے ٹکڑے ڈھونڈ نکالنے کے لیے تین سو سپیشل کتے لائے گئے جو زندگی اور موت کی بو

سونگھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کتوں نے دن رات ایک کر کے بڑی تندہی سے اپنا کام کیا۔

نیویارک سٹی کی عمارتیں ہر وقت ٹورسٹوں کے کیمروں کی زد میں رہتی ہیں لہذا کسی نے طیاروں کے ٹکرانے کی تصاویر اور فلمیں یونہی اتفاقیہ طور پہ ہی بنا ڈالی تھیں۔ وہ کب جانتے تھے کہ وہ اس وقت تاریخ کا ایک اہم لمحہ ریکارڈ کر رہے ہیں۔

بروکلین کی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ سے مشہور زمانہ فوٹوگرافر مارک فلپس نے، جو ایسوسی ایٹڈ پریس کے مانے ہوئے فوٹوگرافر ہیں اس روز کچھ انوکھی تصاویر بنائیں۔ وہ جائے حادثہ سے صرف تین میل دور تھے اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جنوری ۱۹۸۶ء میں چیلنجر Space shuttle کے روانگی کے چند لمحوں بعد ہی تباہ ہونے کے وقت بھی مارک تین میل کے فاصلے پر موجود تھے۔ انھوں نے چیلنجر کی جلتی اور زمین پر کریش ہوتی تصویر بنا کر صحافتی دنیا میں بہت شہرت حاصل کی تھی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جلتی ہوئی عمارات کی تصاویر انھوں نے اپنے ڈجیٹل کیمرے سے کھینچیں اور اچھی طرح دیکھے بغیر ہی فوراً اپنے لیپ ٹاپ کمپیوٹر سے اخبارات کو روانہ کر دیں۔ جب تصاویر چھپیں تو مارک فلپس اور دنیا والے یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ دھوئیں میں ایک ہیبت ناک چہرے کی واضح شبیہ موجود تھی۔ مارک فلپس کہتے ہیں۔ میں ششدر رہ گیا اور میرے منہ سے ایک دم نکلا:

Holy shit - Its the devil.

بہت سے لوگوں نے تصویر کی حقیقت پہ شک وشبہ کا اظہار کیا کہ یہ کمپیوٹر سے رچی گئی ہے جس پہ مارک فلپس بہت جز بز ہوئے۔ کئی ٹی وی انٹرویوز اور اخباری بیانات میں انھوں نے وضاحت کی کہ انھوں نے تصویر کو کسی بھی طرح تبدیل نہیں کیا اور وہ اپنے پیشہ کی حرمت کا پاس رکھتے ہوئے ایسا کبھی نہیں کرتے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس

نے بھی ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے یہی کہا کہ مارک فلپس فوٹوگرافی کے شعبہ میں ایک مستند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی اچھی شہرت اور پروفیشنلزم کو دیکھ کر ان کی بات پہ شک نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تصویر کئی مہینوں تک انٹرنیٹ پہ لوگوں کی توجہ کا باعث بنی رہی اور اس کی بابت قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ اس تصویر کی نمائش سے آمدن ورلڈ ٹریڈ سنٹر ریلیف فنڈ اور دیگر مختلف چیرٹی اداروں کو دے دی گئی۔ یہ تصویر Urban Legend ویب سائٹ پہ آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مین ہٹن ایریا کے سب سکول غیر معینہ مدت کے لیے بند کیے جا چکے تھے' کیونکہ انہیں اب رہائشی کیمپوں کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا۔ آس پاس کی عمارات میں دراڑیں پڑ گئیں تھیں لہٰذا اب وہ قیام کے لیے محفوظ نہیں سمجھی جارہی تھیں' اسی لیے ان کے مکین اب گھر سے بے گھر ہوئے سکولوں میں پڑے ہوئے تھے۔ نیویارک سٹی میں جگہ جگہ صدمے سے ڈیل کرنے کے لیے کاؤنسلنگ کے لیے مراکز کھول دیے گئے جہاں لواحقین اور دیگر شہری آ کر نفسیاتی آسودگی اور رہنمائی حاصل کر سکتے تھے۔ دفاتر کھل جانے پر ہر دفتر میں grief میٹنگ ہوئیں جہاں لوگ اکھٹے ہوئے اور ایک دوسرے کے گلے لگ لگ کر روئے۔ عنبر اور میرے کزن شکوہ نے بتایا کہ وہ اپنے دفاتر میں ان میٹنگوں میں شریک ہوئے' مگر کسی نے ان پر انگلی نہ اٹھائی۔ انہیں اپنے غم میں برابر کا شریک ہی سمجھا۔ وہ دونوں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اظہار افسوس کرتے رہے۔

طبیعت بہت بے چین تھی اور مجھے بار بار اپنی بہن سنبل کا خیال آ رہا تھا جو بے چاری پہلی بار امریکہ آئی تھی اور اب اسے اتنا بڑا حادثہ دیکھنا پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنے کزن ڈاکٹر نگار کے ہاں فلاڈلفیا فون کرنے کی بہت کوشش کی مگر ٹیلی فون نظام میں بے قاعدگی کی وجہ سے فون نہیں ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے موبائل فون سے ٹرائی کرنے

کے بعد بالآ خر فون ہو ہی گیا۔ کزن کی بیگم لبنیٰ سے بات ہو گئی جو بہت ہی ہنس مکھ نرم دل مگر نروس قسم کی خاتون ہیں۔ رنج و غم کی کوئی بات ان سے برداشت نہیں ہوتی۔ انھوں نے پہلے پہل ورلڈ ٹریڈ سنٹر پہ حملہ ہوتے دیکھ کر ہی گھر میں ٹی وی دیکھنے پر پابندی لگا دی کیونکہ جیسے ہی وہ شعلوں میں گھرے ہوئے لوگوں کی بے بسی کے مناظر دیکھتیں، رو رو کر حشر کر دیتیں۔

See no evil, hear no evil. کے اصول پہ کاربند انھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ نہ جاننے میں راحت ہے اور جاننے میں زحمت۔ اس لیے اچھا ہے ٹی وی نہ ہی دیکھوں۔ سنبل بھی کچھ اسی قسم کا مزاج رکھتی ہے اس لیے خوب گزر رہی تھی ان دو دیوانیوں کی آپس میں۔ سنبل کو ویسے بھی ہمیشہ سے حالات حاضرہ، سیاست وغیرہ سے کبھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی لہٰذا وہ بھی حالات کی مکمل سنجیدگی اور نزاکت سے بے خبر تھی۔ ہماری فیملی میں اکثر سنبل سے مذاقاً پوچھا جاتا کہ "سنبل تمہیں پتہ ہے بھٹو مر گیا ہے یا یہ کہ "آج کل کون ہم پہ حکومت کر رہا ہے؟" سنبل اخبار بھی یہ کہہ کر نہیں پڑھتی کہ مجھے ڈپریشن ہوتا ہے۔ جب میں نے اسے حالات کے بارے میں بتایا تو بڑے آرام سے کہنے لگی "ہاں سنا ہے صبح نیو یارک میں کوئی دھماکہ ہوا ہے لیکن میں اور لبنیٰ تو شاپنگ مال جا رہے ہیں تاکہ ذرا دل بہل جائے۔ دھماکوں کا کیا ہے پاکستان میں تو آئے روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔"

میں اپنی بھولی بہن کو کیا بتاتی کہ یہ امریکہ ہے پاکستان نہیں جہاں کبھی کچھ نہیں ہوتا نہ ہو سکتا ہے۔ یہ قوم تو اللہ کی لاڈلی اور نوازی ہوئی قوم ہے۔ امریکن تو "Have Fun" کام اور تفریح کے ویک اینڈ زمنانے کے پروگراموں میں ہی مصروف رہ کر زندگی کے سانس پورے کر جاتے ہیں، انہیں ایسی تباہی، بربادی، ناکامی اور شکست کا بھلا کہاں تجربہ؟ وہ نقصان اٹھانے کے خیال سے سمجھوتہ کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو اب دنیا

کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ لیکن یہ سب باتیں کہہ کر میں اپنی بہن کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا چپکی ہو رہی۔

''کل پرسوں تک تو سب ٹھیک ہو جائے گا نا؟ حالات آخر نارمل ہو ہی جاتے ہیں؟'' اس نے پھر سادگی سے کہا۔

اسے کیا پتہ تھا امریکن لاڈ پیار سے پلی ہوئی ایک ایسی نازک قوم ہے جسے تتی ہوا کبھی چھو کر بھی نہیں گزری۔ جہاں دولت' آسائش' فراوانی آپ کی باندی ہے اگر آپ میں محنت کی صلاحیت ہے۔ جہاں کتے انسانوں سے زیادہ بہتر خوراک اور محبت پاتے ہیں اور کوئی رات کو بھوکا نہیں سوتا۔ اس اللہ کے لاڈلے ملک کو چند دیوانے ہائی جیکرز نے کیف و مستی کی نیند سے ایک دم جھنجھوڑ کر رکھ دیا' وہ خود کوئے یار سے نکلے اور سوئے دار چل دیئے اور یوں پوری دنیا ہلا کر الٹ پلٹ کر ڈالی۔

امریکن میڈیا کو تو اللہ موقع دے' ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے کو ہمہ وقت فوکس کر کے ناظرین کی توجہ کو خوب خوب قابو کیا۔ خبریں قیاس آرائیاں تبصرے' مذاکرے' لعن طعن' الزام تراشیاں' ایک رونق سی لگ گئی میڈیا بازار میں۔ میڈیا جو کچھ بتا رہا تھا سبھی اسے ہضم کر رہے تھے' نگل رہے تھے اور مسمرائز ہوئے ٹی وی سے جڑے بیٹھے تھے۔ میڈیا سامعین' ناظرین' قارئین کو جو کچھ بتا رہا تھا وہی سچ' باقی سب جھوٹ تھا۔ سب کو اسی پہ یقین تھا اور وہی سب کا ایمان۔ میڈیا سرکس کے اکھاڑے میں رنگ برنگے مختلف کرتب دکھائے جا رہے تھے۔ کاروبار خوب چمک رہا تھا۔ مشتاق اور خبروں کے بھوکے عوام کو معلومات کا جو بھی ٹکڑا پھینکا جاتا وہ ندیدوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑتے اور اسے کچا پکا نگل لیتے۔ امریکن میڈیا نے ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور سچ جھوٹ' ظلم و عدل کا فیصلہ گھروں کی ٹی وی سکرینوں پہ ہی کیا جانے لگا۔

یہیں سے اٹھے گا شور محشر

یہیں پہ یوم حساب ہو گا

امریکہ ہمیشہ ہی سے پرسکون اور انڈر کنٹرول قسم کا ملک رہا ہے۔ وہاں اس طرح کا کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ جو بھی ہوتا ہے دوسروں کے ملک اور ان کے گھروں ہی میں ہوتا ہے۔ بربادی کی گرد اُن کے دامن تک اڑ کر کبھی نہیں آتی۔ لیکن آج یہ کیسا عجب دن تھا؟ سورج نہ جانے کس سمت سے طلوع ہوا تھا کہ امریکہ پہ حملہ ہو چکا تھا۔ امریکنوں نے دکھ کا نمک کبھی چکھا نہیں تھا۔ انھوں نے جب بھی جنگ کی' دوسرے ملکوں میں جا کران کے گھروں میں گھس کر کی۔ سمندر پار کر کے گئے اور اگلوں کے گھر بم مار آئے اور ان کے اپنے دیس میں چین کی بنسری بجتی رہی۔ اب کہ یہ کیسی کاری ضرب لگی تھی کہ امریکہ تباہ ہو رہا تھا۔ رو رہا تھا' بلبلا رہا تھا' چیخ رہا تھا اور حیران تھا کہ یہ سب کیسے اور کیوں ہو گیا؟ بعد میں آنے والی خبروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امریکہ انٹیلی جنس کو اس ممکنہ حملہ کے بارے میں کچھ اشارے بھی مل چکے تھے جنہیں انھوں نے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا اور اسی اعتماد پہ بیٹھے تھے کہ امریکہ کا کوئی بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ اسے کبھی گزند نہیں پہنچ سکتی۔ امریکہ گراں خوابی کے عالم میں تھا اور حیران ہو گیا تھا۔ ڈانلڈ رمز فیلڈ ٹی وی یہ کہہ رہا تھا:

They caught us with our pants down.

اور سی این این فلسطینی مسلمانوں کی برسوں پرانی فلم دکھا رہا تھا جس میں وہ خوشی کے مارے ناچ کر مٹھائیاں بانٹ رہے تھے۔

عنبر کے پاس رہتے ہوئے مجھے دو دن گزر چکے تھے مگر میں سٹیٹن آئی لینڈ کاشف کے گھر جانے کے لیے بے چین تھی کیونکہ وہی مجھے امریکہ میں اپنا گھر لگتا تھا' اس ہی کے پاس میں زیادہ ٹھہرتی تھی۔ میرا سامان اور چیزیں بھی وہیں تھیں اور وہ اکیلا تھا۔ عنبر کے پاس اس کا شوہر تھا اور سمی بفلو یونیورسٹی کے ہوسٹل میں محفوظ بیٹھی تھی۔ پبلک

ٹرانسپورٹ بند تھی لوگ گھروں میں خوف کے قیدی بنے چھپے بیٹھے تھے' دفاتر' سکول' سب کچھ بند تھا مگر دریا پار کے ایک دو پُل کھول دیے گئے تھے۔ ظاہر ہے ٹرین اور فیری پہ سٹیٹن آئی لینڈ جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے عنبر میرے اصرار پہ مجھے ڈرائیو کر کے سٹیٹن آئی لینڈ چھوڑنے پہ رضامند ہو گئی اور ہم کار میں بیٹھ گئے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر ہم نے حیرت انگیز طور پر صرف آدھ گھنٹے میں طے کر لیا کیونکہ سڑکوں پہ ٹریفک برائے نام موجود تھی۔ سنسان شاہراہوں پہ گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی حالانکہ نیویارک کی ہائی ویز پہ ٹریفک جام ہونا ایک معمول کی بات ہے مگر اس وقت وہ ایک Ghost town لگ رہا تھا۔ میں نے نیویارک کو اتنا ویران اور آزردہ کبھی نہیں دیکھا۔ ہم ویرازانو برج پہ پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ اس روز مسافروں سے سات ڈالر کا ٹول ٹیکس بھی نہیں لیا جا رہا تھا تاکہ لوگ ڈرائیونگ کریں' گھر سے نکلنے کے خوف کو پس پشت ڈال دیں اور نارمل محسوس کریں۔ امریکہ میں عوام کی سہولیات کے لیے جب بھی کچھ کیا جاتا ہے تو دل اس کو بہت سراہتا ہے۔ حکومت عوام سے دبا کر ٹیکس تو لیتی ہے مگر عوام کو آسانیاں بھی خوب بہم پہنچاتی ہے۔ ایک فائدہ یہ بھی ہے ایک ترقی یافتہ ملک میں رہنے کا۔

سٹیٹن آئی لینڈ پہنچی تو یہ جان کر بہت دل برا ہوا کہ اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں جہاں میں کاشف کے ساتھ رہتی تھی' رہنے والے کئی افراد' جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کرتے تھے اب نہ رہے تھے۔ سٹیٹن آئی لینڈ کے رہنے والے بہت سے فائر مین بھی لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ مجھے اپنی اپارٹمنٹ کمپلیکس کے لانڈری روم میں ملنے والی وہ سفید فام گوری عورت یاد آ گئی جس سے میں نے ایک ہفتہ قبل ہی اس کے گرما گرم لہجے کے جواب میں اس سے پُراعتماد انداز میں اسی کی طرح گفتگو کر کے اسے چپ کروا دیا تھا۔ ویسے تو امریکن قوم عام طور پہ بڑی فرینڈلی ہوتی ہے لیکن وہ عورت پتہ

نہیں کس مزاج کی تھی کہ اس نے مجھے بھی چڑا دیا۔

ہوا یہ کہ میں میلے کپڑوں کا تھیلا اٹھا کر جب لانڈری روم پہنچی تو ساری مشینیں چل رہی تھیں' سوائے ایک کے۔ دیکھا تو اس کا ٹائمر پورا ہو چکا تھا۔ میں نے دستور کے مطابق اس مشین میں سے کپڑے نکالے اور مشین کے اوپر والی جگہ پہ رکھ کر اپنے کپڑے ڈال دیے کہ اس کا مالک یا مالکن آئے اور انہیں ڈرائیر میں ڈال کر سکھا لے۔

ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ایک امریکن عورت تیزی سے لانڈری روم میں داخل ہوئی اور آ کر مجھ پہ بگڑنے لگی کہ میں نے اس کے گیلے کپڑے مشین سے باہر نکالنے کی جرأت کیسے کی۔ میں نے اسے آرام سے جواب دیا کہ مجھے مشین کی ضرورت تھی اور تمہارا واشنگ سائیکل پورا ہو چکا تھا' لہٰذا میں نے اس میں کوئی قباحت نہ سمجھی اور اس کے کپڑے باہر نکال دیئے۔

''لیکن تم نے میرے دھلے ہوئے کپڑوں کو ہاتھ کیوں لگایا؟'' وہ بدستور بکتی گئی۔

''تو کیا میں تمہارے انتظار میں وہاں کھڑی رہتی۔ اگر میں نے تمہارے کپڑوں کو ہاتھ لگا دیا تو کیا قیامت آ گئی؟'' کیا میرے ہاتھ گندے ہیں؟'' میں نے اپنے ہاتھ اسے غصے سے دکھائے۔ مجھے بھی اب تاؤ آ گیا تھا۔

''لیکن کپڑے میری پرائیویٹ پراپرٹی ہیں۔ تمہیں انہیں ہاتھ لگانے کا کیا حق ہے؟'' وہ بضد رہی۔

''کیا یہاں کہیں کسی نے کوئی سائن لگایا ہوا ہے کہ آپ مشین میں سے کسی کے کپڑے نہیں نکال سکتے؟ جاؤ جا کر پولیس کو بلا لو۔ آئی ڈونٹ کیئر۔' میں نے بھی اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور وہ بکتی جھکتی واپس چلی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے شلوار قمیض میں ملبوس دیکھ کر کسی گھٹیا قوم کی مخلوق سمجھا ہے۔

''بڑی آئی۔'' میں نے بھی اسے خوب کوسا۔ لیکن وہ گزشتہ ہفتے کا واقعہ تھا اور اب

حالات بدل چکے تھے۔ اگر اب لانڈری روم میں یہ واقعہ ہوا ہوتا تو شاید میں کچھ دب جاتی۔ اس اعتماد سے گوری کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ کتنا فرق پڑ گیا تھا ایک ہفتے میں۔ حالات کیا سے کیا ہو چکے تھے۔ امریکہ میں ہم اجنبی ہو چکے تھے۔

☆☆

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا جلا ہوا ملبہ اور راکھ ٹرکوں میں بھر کر ہڈسن دریا پہ تیرنے والے بڑے بڑے بحری جہازوں میں لاد کر سٹیٹن آئی لینڈ پہنچنے لگا۔ سٹیٹن آئی لینڈ کے "Fresh Kills Dump" کے اب نئے معنی پیدا ہو چکے تھے۔ اب یہ ایک عام ڈمپ کی جگہ ایک قبرستان بن چکا تھا جہاں راکھ بکھیر دی جاتی' ملبے کے ذرّے ذرّے کی چھان پھٹک کی جاتی' اس کے اجزاء کو لیبارٹری میں بھیجوا کر نتائج نوٹ کر لیے جاتے۔ تحقیقات کے لیے یہ سب ضروری تھا۔

سٹیٹن آئی لینڈ میرا اور کاشف کا جزیرہ تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹا نہ چاہتے ہوئے بھی شام کو دریا کنارے جا کھڑے ہوتے اور ہڈسن پار سے نظر آنے والی نیویارک سکائی۔ لائن کو گھنٹوں تکتے رہتے۔ دھواں تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ Rescue مشن سے اٹھنے والی بڑی بڑی نیلی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں۔ فیری ٹرمینل کے پارکنگ لاٹ میں کئی ایسی گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے مالکان گیارہ ستمبر کو حسب دستور فیری میں سوار ہو کر مین ہٹن کام پہ گئے تھے مگر شام کو لوٹ کر گھر نہ آ سکے تھے۔ ان کی گرد آلود کاروں پہ رکھے پھول' کارڈز' بندھے ہوئے رنگ برنگے ربن دل کو مٹھی میں لے لیتے تھے۔ سٹیٹن آئی لینڈ کے رہنے والے اداس چہرے لیے خاموشی سے اپنے وڈیو کیمروں میں دور سے نظر آتے بڑے بڑے بلڈوزر' دھوئیں' روشنی اور تاریکی میں ڈوبے دریا کا عکس فلم بند کرتے کہ ایسا منظر انھوں نے پہلے کب کہاں دیکھا تھا۔

حادثے کو تین چار دن گزر گئے تو سنبل نے گھبرا کر مجھے فلاڈلفیا سے فون کیا کہ میرے پاس آ جاؤ۔ یہ سن کر کہ تمام فلائٹیں غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دی گئی ہیں

وہ فکرمند ہوگئی کہ وہ اب پاکستان واپس کیسے جائے گی۔اسے اپنے بچوں کی یاد آنے لگی اور حالات کی سنجیدگی کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔عجیب بات یہ ہے کہ میرے بچے اکثر مجھ سے دور ہی ہوتے ہیں لیکن اتفاقاً اس کرائسس کے وقت میں' میں ان سے قریب تھی' ورنہ میرا بھی نہ جانے کیا حال ہوتا۔میں اپنی اور اپنے بال بچوں کی خیریت پہ خدا کی شکرگزار تھی۔میرے بچے گو کہ مختلف شہروں میں تھے لیکن پھر بھی جتنا ممکن ہوتا فون کرتے اور مجھ سے رابطہ قائم رکھتے۔سنبل کی پریشانی کا اندازہ کر کے میں نے فلاڈلفیا جانے کا پروگرام بنالیا اور کاشف سے کہا کہ مجھے نیوجرسی سے فلاڈلفیا کی ٹرین میں سوار کرادے۔

سفر شروع کرنے سے پہلے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ میں معمول کے مطابق شلوار قمیض نہیں بلکہ لانگ سکرٹ اور بلاؤز پہنوں گی کیونکہ اس وقت تک امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصّب کی آگ کچھ کچھ بھڑکنا شروع ہو چکی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ سفر میں کوئی مجھ پر ناگوار انداز میں نگاہ ڈالے۔ٹرین سٹیشن پہ لگی مشین میں ہم نے پیسے ڈالے اور وہاں سے ایک پرنٹڈ ٹکٹ نکال کر ٹرین آنے کا انتظار کرنے لگ۔ایک مسافر لڑکے سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہاں سے ٹرین Trenton لے جائے گی جو نیوجرسی کا آخری سٹاپ ہے' وہاں سے آپ کو فلاڈلفیا کے لیے دوسری ٹرین لینا ہوگی۔

میں نے اچھی طرح سمجھ کر بغیر دیکھے ٹکٹ سنبھال لیا اور ٹرین کے پلیٹ فارم پہ آتے ہی بیٹے کو خدا حافظ کہہ کر اس میں سوار ہوگئی۔گاڑی میں بیٹھ کر اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیا تو اس میں بہت سے دیسی یعنی انڈین پاکستانی لوگ سفر کرتے نظر آئے۔نیوجرسی میں چونکہ ان کی آبادی بہت زیادہ ہے۔اس لیے وہ کام کرنے کے لیے صبح نیویارک آتے اور شام کو ٹرین میں بیٹھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔خلاف

معمول کوئی بھی دیسی اپنے لباس میں نہ تھا بلکہ سبھی نے میری طرح امریکی طرز کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میں نے کان لگا کر سنا' ہر مسافر ورلڈ ٹریڈ سنٹر ہی کا ذکر کر رہا تھا اور اس پہ ششدر تھا۔ دیسی لوگ کچھ خائف کچھ خفیف سے بیٹھے سنی ان سنی کرنے کی کوشش کرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک پندرہ سولہ سالہ دیسی لڑکا بڑے مزے سے اپنے موبائل پہ کراچی سٹائل اردو میں زور زور سے باتیں کر کے ہنس رہا تھا یوں جیسے وہ کوئی عجب دن نہ ہوں نارمل دن ہوں۔ میں نے بچے کو اشارے سے ایک طرف بلایا اور سمجھایا کہ اس وقت ذرا احتیاط کرے' انگلش میں بات کرے اور وہ بھی ذرا دھیمے انداز میں۔ بچہ سمجھ گیا اور اس کے بعد اس نے ایسی زبردست امریکن انگریزی بولی کہ میں اس انقلاب پہ حیران رہ گئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دو سال قبل ہی امریکہ آیا تھا لیکن اس کا لب ولہجہ دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ شاید وہ پیدائشی امریکن ہے۔

چند مسافر سنجیدگی سے اخبار بینی میں مصروف تھے اور چند یونہی کھڑکیوں سے باہر جھانک کر وقت گزار رہے تھے۔ ایک گورا امریکی جوڑا نشے میں دھت حال سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ ایسے لوگوں کو جن کی شخصیت میں تعلیم' تہذیب' نفاست' اچھی پرورش کی جھلک نہ دکھائی دے امریکہ میں وہائٹ ٹریش White Trash پکارا جاتا ہے۔ یہ جوڑا ہر لحاظ سے وہائٹ ٹریش کی مکمل تصویر نظر آتا تھا۔ ان کی حرکات دیکھ کر مجھے کراہت سی محسوس ہوئی مگر میں نے کچھ نہ ظاہر کرتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

لوگ دھیرے دھیرے اترتے چلے گئے۔ مگر میرا اسٹیشن آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ہر سٹیشن پہ اناؤنسمنٹ ہوتی مگر کچھ پلے نہ پڑتا۔ اناؤنسمنٹ چاہے پاکستان میں ہو یا امریکہ میں جہاز کی ہو یا ٹرین کی' سمجھنا ہمیشہ ہی مشکل ہوتی ہے۔ نہ جانے کیوں؟ میرے کان Trenton لفظ پہ فوکس تھے مگر Trenton لفظ کانوں میں سنائی ہی

نہیں دے رہا تھا۔ میں بھی بے نیازی سے اخبار بینی میں مصروف ہوگئی۔ شام ہوتے ہوتے ٹرین تقریباً خالی ہوگئی اور ایک غیر آباد جنگل میں جا کر رک گئی جہاں وہ شرابی بدتمیز جوڑا بھی اتر گیا اور میں ٹرین میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ دل ہی دل میں یہ سوچ کر حیران ہونے لگی کہ کیا صرف مجھے ہی ٹرینٹن جانا تھا؟ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ میرے بالکل سامنے والے ڈبے میں ٹرین آپریٹرز' کنڈکٹرز وغیرہ اکھٹے ہوگئے اور آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ٹرین کے بیچ والے سارے دروازے آٹومیٹک طریقے سے کھل چکے تھے اور میں اپنی نشست پہ بیٹھی ہوئی آخر تک یہ دیکھ سکتی تھی کہ میرے سوا پوری ٹرین میں کوئی بھی مسافر موجود نہیں تھا۔ پانچ چھ لمبے تڑنگے ہٹے کٹے گورے کالے امریکی مردوں کے درمیان خود کو اکیلا پا کر میں کچھ نروس سی ہوگئی۔ ابھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر ایک کچا' تازہ زخم تھا اور میں دشمن قبیلہ کی ایک تنہا عورت۔ کچھ دیر بعد ٹرین سٹاف نے میری جانب دیکھا اور آپس میں کچھ بات چیت کی۔ میں ڈر گئی اور جتنی دعائیں یاد تھیں پڑھنا شروع کر دیں اور اللہ کو مدد کے لیے پکارا۔ یا اللہ میری حفاظت کرنا۔ ہندو پاک بٹوارے کے وقت کے واقعات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ صنفِ نازک کے ساتھ ایسے وقتوں میں ہمیشہ ہی ظلم و زیادتی ہوتی ہے۔ میں اس وقت حقیقی طور پہ خوفزدہ ہوگئی حالانکہ میں نے زندگی کے بہت سے طوفانوں کا تن تنہا مقابلہ کیا ہے اور اپنے تئیں خود کو ہمیشہ بہت بہادر سمجھتی ہوں مگر...... یہ وقت بڑا عجیب تھا۔ میرا خون خشک ہونے لگا۔ اس وقت امریکنوں کو ہر مسلمان زہر لگتا تھا' نفرت اور تعصّب کی بپھری ہوئی بلا ہر منطق کو بلا سوچے سمجھے ہڑپ کیے جا رہی تھی۔

ایک لمبا چوڑا کنڈکٹر میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ویل لیڈی آپ ٹرین سے کیوں نہیں اتریں؟'' اس نے خلاف توقع مجھ سے بڑے ادب سے پوچھا۔

''میں آخری سٹیشن ٹرینٹن Trenton پہ اتروں گی۔'' میں نے نظریں جھکا کے جواب دیا۔

''ڈونٹ یونو کہ اس ٹرین کا آخری سٹیشن Rahway ہے جو پیچھے رہ گیا ہے۔ اس پہ ٹرین خالی ہوگئی تھی شاید آپ نے غور نہیں کیا۔''

''اوہ مائی گاڈ۔'' میرا دل بیٹھ سا گیا۔ ''لیکن مجھے تو فلاڈلفیا جانا ہے' ٹرینٹن سے دوسری ٹرین بدلنا ہے۔'' میں پریشان ہوگئی۔

اس نے میرے ہاتھ سے ٹکٹ لے لی اور دیکھ کر کہنے لگا۔

''آپ تو شروع ہی سے غلط ٹرین پہ سوار ہیں۔''

''تو اب؟'' میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

وہ میری ٹکٹ لے کر دوسرے کنڈکٹروں کے پاس چلا گیا' سب نے آپس میں سر جوڑ کر کچھ ڈسکس کیا اور پھر وہ دوبارہ میرے پاس آ گیا۔

''دیکھئے لیڈی ''ٹرین اب واپس اسی ٹریک پہ چلائی جائے گی اور جب ہم دوبارہ Rahway پہنچیں گے تو آپ اتر جایئے گا۔ پلیٹ فارم سے نیچے اترنے کے بعد دائیں ہاتھ سڑک پار کر کے سٹیشن کی دوسری جانب جا کر ٹرینٹن کی ٹرین کا انتظار کیجئے گا جو ہر گھنٹے بعد آتی ہے۔'' Rahway کتنا عجب لفظ تھا۔ راہ اور وے کا مطلب ایک ہی تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس لفظ کی اوریجن کے بارے میں پل بھر کو سوچا۔

''اور میری ٹکٹ؟' مجھے اپنے پندرہ ڈالر کے ضیاع کا افسوس ہونے لگا۔ اس نے پل بھر کو میری طرف دیکھا اور پھر اسے ایک دوسری جگہ سے پنچ کر کے بولا۔ ''اصولاً تو آپ کو نئی ٹکٹ درکار ہے لیکن چونکہ ایسا غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے لہٰذا میں آپ کو اسی ٹکٹ پہ رعایت دے دیتا ہوں۔ اس پہ لکھ دیتا ہوں کہ آپ اسی ٹکٹ پر دوبارہ سفر کر سکتی ہیں۔ "Enjoy your Journey"

وہ مسکراتا ہوا میرے پاس سے چلا گیا اور جا کر اپنے ساتھیوں سے باتیں کرنے لگ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ میرا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا ورنہ، لینے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے۔ امریکن قوم کی فرض شناسی، باقاعدہ پن اصول پرستی اور سسٹم کی بالا دستی دیکھ کر سمجھ میں آ جاتا ہے کہ بالآخر یہ اتنی کامیاب و سرفراز کیوں ہے۔ سپر پاور بننے کے لیے پہلے اپنے اندرونی نظام اور انفراسٹرکچرز کو مضبوط کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر دنیا کے تخت پہ بیٹھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا، بے اصولی اور بے قاعدگی کو ہی طرز زندگی سمجھ لیا جاتا ہے اور اسی لیے ہم مار کھا جاتے ہیں، پیچھے رہ جاتے ہیں۔ شکر ہے عملہ اتنا فرض شناس تھا۔ مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔

امریکی قوم سیاسی طور پہ دنیا کے نقشے پہ موجود جس ملک میں چاہے دندناتی پھرتی ہے مگر انفرادی طور پہ عام امریکن بہت فراخ دل، دوستی پسند، خاصی حد تک دنیاوی معاملات سے لاتعلق اور لاعلم ہوتا ہے۔ عام انسانوں سے تعصب کے بغیر پیش آتا ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

فلاڈلفیا ایریا میں میری بہت پرانی مخلص دوست روبینہ رہتی ہے جس نے اپنے پاکستانی شوہر سے علیحدگی کے بعد اپنے سے کم عمر امریکن گورے سے شادی کر رکھی ہے۔ روبینہ پہلے میری ہی طرح ہلکی پھلکی مسلمان تھی لیکن پھر اس کی زندگی میں انقلابی طور پر اسلام آیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے روبینہ کٹر Born again مسلمان ہو گئی۔ حجاب لینا شروع کر دیا اور اپنی زندگی کا انداز بدل لیا۔ روبینہ کے موجودہ شوہر طارق اور وہ دونوں آپس میں بڑی اچھی ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ دونوں کی دلچسپی صرف اور صرف اسلام ہے۔ وہی ان کا اوڑھنا بچھونا، وہی ان کی ایکٹی وٹی اور وہی ان کی مصروفیت ہے۔ دونوں امریکہ میں ہونے والی اسلامی کانفرنسوں میں

زور وشور سے شرکت کرتے اور تبلیغ کے سلسلے کو آگے پھیلاتے ہیں۔

طارق صاحب عراق امریکہ کی جنگ میں بحیثیت امریکی فوجی پائلٹ عراقیوں سے لڑنے گئے تھے۔وہ عام امریکی نوجوانوں کی طرح شراب کے رسیا اور میوزک بینڈ میں گٹار بجاتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اس کے علاوہ بھی زندگی کا کوئی اور طور ہوسکتا ہے۔وہ بتانے لگے کہ بغداد میں قیام کے دوران وہ فارغ وقت میں مسجدوں میں جا کر بیٹھتے اور علماء سے باتیں کیا کرتے تھے۔اسی اولین شناسائی کے مرحلے کے بعد وہ دھیرے دھیرے اسلام کو دل دے بیٹھے اور ایک بدلے ہوئے منور باطن کے ساتھ واپس امریکہ لوٹے۔انھوں نے بتایا کہ ان کے علاوہ پچیس ہزار امریکن فوجیوں نے بھی وہیں اسلام قبول کیا اور اپنے نئے ناموں اور بدلے ہوئے ذہن کے ساتھ اپنی سرزمین پہ واپس قدم رکھے۔

روبینہ میری بے تکلف دوست ہے۔میرے لیے اس کا یہ سب کچھ کرنا کافی حیران کن تھا۔

ایک روز میں نے اس سے ہمت کر کے پوچھا۔

''روبینہ یہ تو بتاؤ تم نے آخر ایک امریکی مرد اور جو عمر میں بھی تم سے چھوٹا ہے سے شادی کیسے کر لی؟ کیا تمھیں اس سے محبت ہوگئی تھی؟'' کیونکہ اگر محبت ہوگئی تھی تو پھر تو اس کا ایسا بولڈ قدم اٹھانا' معاشرتی زنجیروں کو توڑنا سمجھ میں آجاتا ہے ورنہ......میرے نزدیک تو ایسا قدم اٹھانا بہت بہادری کا کام ہے۔

''یہ بات نہیں۔میں نے شادی اس لیے کہ کہ اسلام میں اس کا حکم ہے اور میں مکمل طور پہ اسلامی احکامات پہ عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتی ہوں۔'' اس نے مجھے صاف صاف بتادیا۔

''لیکن پیاری' امریکن آدمی......' آخر ہم پاکستانی ہیں' اپنے کلچر سے ہوتا تو......''

میں ایک روایتی مشرقی' پاکستانی' گھٹے ہوئے ذہن کی مالک عورت کی طرح بولی۔

''بات یہ ہے کہ مجھے میرے شوہر نے پانچ بچوں کے بعد چھوڑ دیا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے لیے بغیر کسی مرد کی مدد کے' زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ میں نے کوشش کی کہ میں کسی پاکستانی آدمی سے نکاح کرلوں مگر کوئی پاکستانی مرد مجھے میرے بچوں سمیت قبول کرنے کو تیار نہیں ہوا اور میں اپنے بچے کسی قیمت پہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی' لہٰذا میں نے پاکستانی آدمی کو جیون ساتھی بنانے کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ اسلامی میٹنگز میں میری شناسائی طارق سے ہوگئی اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک اچھا مسلمان ہے۔ اس نے بھی حضورﷺ کی پیروی کرتے ہوئے مطلقہ' اپنے سے بڑی عمر کی عورت کو پیام بھیجا جو میں نے قبول کرلیا اور ہماری شادی ہوگئی۔ اب وہ میرے بچوں کی پرورش میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے' میرا ساتھ نبھاتا ہے تو بس ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔''

لیکن پھر بھی تم نے بڑی ہمت دکھائی۔ کم از کم میں تو ایسا قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔'' میں نے پھر پوچھا۔

بات یہ ہے کہ میں جانتی ہوں لوگوں کو میری یہ شادی بڑی عجیب لگی ہوگی۔ ہمارے اپنے علاقے کی پاکستانی کمیونٹی میں لوگوں نے مجھے طرح طرح کی باتیں بنائی ہیں لیکن مجھے اسلام سے طاقت ملی ہے۔ جب اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ تو کسی بھی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔'' وہ بولتی چلی گئی اور میں سوچنے لگی کتنے افسوس کی بات ہے۔ ہماری پاکستانی سوسائٹی میں اول تو مطلقہ عورت کی دوبارہ شادی ہوتی ہی نہیں۔ پھر پانچ بچوں کی ماں کو تو پاکستانی آدمی کبھی اپنانے کی خواہش نہیں کرسکتا۔ اسلام میں عورتوں کے خلاف ایسا کوئی حکم یا تعصّب رکھنے کی روایت یا اجازت نہیں مگر پھر بھی مرد جب شادی کرنا چاہتا ہے تو کنواری یا بغیر بچوں والی عورت ہی اس کی ترجیح ہوتی ہے۔

نومسلم اس لحاظ سے کھلے ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ عورت کو بطور ایک انسان، ایک شریک حیات کے طور پر دیکھتے اور پرکھتے ہیں، اسے کوئی شے نہیں سمجھتے۔

روبینہ اور طارق کے درمیان میں نے ایک بڑی خوبصورت دوستی دیکھی جو اگر شادی شدہ جوڑوں کے تعلق میں ہو تو ایک نگینے کی طرح چمکتی، چھل بل کرتی نظر آتی ہے۔ افسوس کہ اکثر جوڑوں کو یہ ریشمی احساس نصیب نہیں ہوتا۔ نیچی نگاہوں، سنہری ڈاڑھی، بات بات پہ الحمدللہ کہنے والے کم گو طارق اور روبینہ کو گیارہ ستمبر کے بعد بہت تشویش ہو رہی تھی کہ مسلمانوں کا اب نہ جانے کیا حال ہونے والا ہے۔ روبینہ کے دو بھائی بھی نیوجرسی ایریا میں رہتے ہیں جو اپنی بہن کی طرح شدید مسلمان ہو چکے ہیں۔ لمبی لمبی ڈاڑھیاں، ٹخنوں سے اونچی شلواروں میں ملبوس وہ اسلام کے بارے میں بات کرتے ہوئے بڑے جذباتی اور غصیلے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کو قریبی اسلامک سکول میں داخل کروا رکھا ہے جہاں ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اسلامی خطوط پہ کی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں اس وقت تقریباً چار سو اسلامی سکول کام کر رہے ہیں۔

اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اسلامک سنٹر اور سکولوں کو اپنی حفاظت کی فکر ہو رہی تھی کیونکہ دھمکیاں بھی مل رہی تھیں اور کچھ نہ کچھ توڑ پھوڑ بھی شروع ہو چکی تھی۔ روبینہ کے دونوں بھائی دوسرے بچوں کے مسلمان والدین کی طرح اپنے بچوں کے اسلامی سکول کی چوکیداری کی ڈیوٹیاں دینے لگ گئے تھے۔ تبلیغی جماعت کے ارکان جیسے حُلیئے بنائے دونوں برادران امریکہ دشمن جذبات کا آزادانہ اظہار کرتے اور ہر وقت بپھرے رہتے۔ ماضی میں ایک بار ایک نے وہائٹ ہاؤس فون کر امریکی پالیسیوں کی نکتہ چینی بھی کی تھی۔

باتوں باتوں میں روبینہ کے امریکی شوہر طارق سے میں نے اس کے تبدیلیِ

مذہب کے فیصلے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے اپنے سوالات کے جوابات نہیں ملتے تھے، میرے اندر تشنگی اور بے سکونی بھری ہوئی تھی۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد مجھے بہت سی باتوں کی سمجھ آ گئی اور تبھی سے میں نے اسلام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

تشنہ سوالوں کے جواب میسر آنے کے بعد اب وہ مسلمان ہو کر نہ صرف یہ کہ اچھا انسان بن گیا تھا بلکہ اچھا شوہر، اچھا بھائی اور اچھا بیٹا بھی سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کے امریکی والدین حیران اور خوش تھے کہ ان کے بیٹے کے کردار میں اتنی ٹھوس اور مثبت تبدیلی کیسے آ گئی؟ انہیں اپنے بیٹے کے فیصلے پہ کوئی اعتراض نہ ہوا تھا کیونکہ وہ اس تبدیلی کی وجہ سے ان سے پہلے کی نسبت بہتر طور پہ پیش آتا تھا اس لیے تنقید کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ بہر حال یہ ان کی کشادہ دلی تھی۔

امریکہ کے ایک مشہور Convert مسلمان یوسف اسلام کی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ سیونیٹز میں یہ امریکی ایک مشہور گلوکار Cat Stevens کے نام سے اپنے کیریئر کے عروج پہ تھا۔ اس کے گانے بے حد مقبول تھے مجھے بھی بہت پسند تھے۔ پھر ہوا یہ کہ Cat Stevens منظر سے غائب ہو گیا اور کئی سال تک اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ یہی سننے میں آیا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے اور اس نے گانا چھوڑ دیا ہے۔ ٹی وی کے ایک حالیہ انٹرویو کے دوران مجھے اس مقبول گلوکار کی کہانی سننے کا موقع ملا جو کچھ یوں تھی کہ ایک روز وہ کیلیفورنیا کے سمندروں میں Surfing کر رہا تھا کہ اتنی طاقتور لہر آئی کہ اسے لگا وہ ڈوب جائے گا اور بچے گا نہیں۔ کہنے لگا "میں نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا اور اسے پکار کر کہا "اے خدا اگر تو اس وقت مجھے زندگی بخش دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ باقی عمر تیری خدمت میں بسر کروں گا۔" کیٹ سٹیون کا کہنا ہے کہ اس خیال کے آتے ہی نہ جانے کیا ہوا کہ اس لہر نے اپنی پوری طاقت سے مجھے

اٹھا کر ساحل پہ پٹخ دیا وہ بچ گیا مگر ایک مستقل حیرت میں بھٹکنے لگا۔

وہ سوچتا رہا کہ وہ اپنی سمت کا تعین کیسے کرے؟ اسی دوران وہ اپنے بھائی سے ملنے یروشلم چلا گیا۔ وہاں گلی گلی بھٹکتے ایک روز ایک مسجد سے اذان کی آواز سن کر سحر زدہ ہو گیا اور اندر چلا گیا۔ مسجد کے گنبد کے اندر لکھی ہوئی آیات دیکھ کر موذن سے باتیں کرتا، وہ ایک ایسی نئی دنیا میں پہنچ گیا جہاں اسے ہدایت اور روشنی کے ساتھ ساتھ امن اور سکون کے بھی پیغام ملے۔ دھیرے دھیرے وہ اسلام میں پورے کا پورا داخل ہو گیا۔ اب وہ مسلمانوں کے لیے دنیا بھر میں مشنری اور رفاہی کام کرتا ہے۔ بچوں کے لیے اسلامی میوزک کمپوز کرتا ہے۔ اس نے بوسنیا کے مسلمانوں کے لیے آواز اٹھائی، وہاں گیا اور ان کے ساتھ ان کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ امریکہ ٹی وی والے اکثر اس سے انٹرویو لیتے رہتے ہیں۔ اس نے یہ دلچسپ بات بھی بتائی کہ اس نے اسلامی روایات کا پاس رکھتے ہوئے شادی بھی ارینجڈ طریقے سے کی جس میں ڈیٹنگ وغیرہ کا کوئی سلسلہ شامل نہ تھا۔ اب وہ ایک مکمل طور پر پرسکون زندگی گزار رہا ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد مسلمانوں پہ لگے الزام کا جواب دینے کے لیے، کیٹ سٹیون اور محمد علی باکسر بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے گراؤنڈ زیرو گئے اور وہاں جا کر اس تباہ کاری کی شدید مذمت کی۔ ان دونوں کا ایک ہی موقف تھا کہ کوئی سچا مسلمان ایسا خونی کام نہیں کر سکتا کیونکہ اسلام تشدد کا نہیں امن و آشتی کا پیام دیتا ہے۔ محبت کا پرچار کرتا ہے۔ ایسی خونریزی کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

روبینہ اور طارق اپنی کمیونٹی میں مسلم مخالف جذبات کا احسن طریق سے جواب دے رہے تھے اور مسلمانوں کا نام بدنام ہونے پہ بہت رنجیدہ تھے۔ ایک روز جبکہ میں ان کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی وہ مجھے لے کر اپنی کمیونٹی کی ایک انٹرفیتھ چرچ میٹنگ میں شریک ہوئے جہاں قریبی علاقوں کے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، یہودی افراد اپنے اپنے

خیالات کا اظہار کرنے کو اکھٹے ہوئے تھے۔

سکھ بچیوں نے جینز، ٹاپ اور سر پہ دوپٹہ لے کر اپنی گربانی سنائی اور یہودی راہبہ نے تلمود سے اقتباس پیش کیا جو بہت ہی خوبصورت کلمات پہ مبنی تھا۔ دیکھا جائے تو یہودی اور ہمارے مذہب میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ ہمارے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں مگر افسوس یہ دو اقوام کبھی ایک دوسرے کے ساتھ سکون سے رہنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ ایک کرسچن نن نے انجیل میں سے Hymns سنائیں اور ہندو مہارشی نے گیتا کا پاٹ کیا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر بڑی خوبصورتی سے اپنی اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق اچھی اچھی اور محبت بھری باتیں سنائیں مگر افسوس جب مسلمان امام صاحب کی باری آئی تو وہ کسی کو متاثر نہ کر سکے۔

مولوی صاحب کو نہ تو اچھی طرح بولنا آتا تھا اور نہ ہی انھوں نے کوئی ایسی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے مذہب اسلام کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں دور ہو سکتیں۔ میں نے روبینہ اور طارق سے کہا کہ ان مولانا صاحب کی جگہ ان دونوں کو اسلام کی نمائندگی کرنا چاہیے تھی کیونکہ یہ اسلام کو علمی طور پہ جانتے پڑھتے اور سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب تو بس کسی دیہاتی مولوی ہی کی طرح تھے۔ کسی طرح بھی سامعین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

عجیب لگ رہا تھا کہ ہر مذہب کے لوگ ایک چرچ میں مل بیٹھ کر دوستانہ ماحول میں آپس میں بات چیت کر رہے ہیں اور مذہبی منافرت کے خلاف اظہار خیال کر رہے ہیں۔ مجھے غالب جی یاد آنے لگے جو کہہ گئے تھے

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے!

سبھی ایک خدا کے ماننے والے اور سبھی ایک دوسرے کے دلوں کے رازوں سے

اتنے ناواقف۔ اتنے متنفر، اتنے منتشر، اتنے بے بھروسہ۔

طارق اب بھی امریکن آرمی کے ریزرو Reserve کا تنخواہ دار تھا اس لیے عین ممکن تھا کہ اسے افغانستان پہ حملہ کے لیے کال کر لیا جائے۔ وہ اس خدشے کی وجہ سے کافی پریشان تھا اور بار بار اپنی شریک حیات روبینہ سے کہتا تھا۔ ''میں اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف کیسے ہتھیار اٹھا سکتا ہوں۔ میں ان سے جنگ کیسے کر سکتا ہوں؟''
روبینہ اسے تسلیاں دیتی مگر آخر پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اسے بلا لیا گیا مگر اس نے اپنے کمانڈر آفس کے پاس جا کر اسے صاف کہہ دیا کہ میں اب مسلمان ہوں ایک تو میرا conflict of Interest ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ میں اپنی بیوی بچوں کو ان ناموافقانہ حالات میں اکیلا چھوڑ کر جانے سے مطمئن نہیں۔ اس کے افسر نے اس کی بات کو سنجیدگی سے لیا سمجھا اور اسے باعزت فراغت دے دی۔ ایسی اصول پرستی بھی بس امریکہ ہی میں ہو سکتی ہے کہ آپ اس طرح کا کوئی جواز پیش کریں اور اسے قبول کر لیا جائے۔ ہمارے ہاں کوئی ماتحت اس طرح کا نخرہ کرے تو اول تو اسے کوئی سنجیدگی سے لے گا ہی نہیں پھر یہ کہ اس پر غداری کا الزام بھی لگا دیا جائے گا۔ لیکن اس وقت طارق کی بچت ہو گئی۔

گیارہ ستمبر کے بعد سارے امریکہ میں جیسے بھوت سا پھر گیا۔ عجیب سی نحوست اور اداسی نے چاروں طرف ڈیرے ڈال دیے اور لوگوں نے ڈر کے مارے گھروں سے کم کم نکلنا شروع کر دیا۔ کاروبار بند ہو گئے، کمپنیاں ٹھپ ہو گئیں، ایئر لائنز کو گھاٹے پڑ گئے۔ دو ملین نوکریاں ختم کر دی گئیں۔ سٹاک ایکسچینج کو ساڑھے چار Trillion ڈالر کا خسارہ ہوا۔

صرف نیویارک ہی نہیں بلکہ پورے امریکہ میں منعقد ہونے والی تقریبات، میلے، فنکشن کینسل ہو گئے۔ لوگوں کا موڈ ہی بدل گیا۔ سبھی سہمے سہمے، اداس، رنجیدہ سے ہو

گئے۔ پاکستانی بھی کافی محتاط ہو کر رہنے لگے۔ پبلک پلیس پہ تو خیر نا ممکن تھا لیکن لوگوں نے گھروں میں بھی نجی محفلیں منعقد کرنا بند کر دیں کہ کہیں اتنے سارے مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں کو دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ کوئی تخریبی میٹنگ ہو رہی ہے یا امریکہ کے یوں پیٹے جانے کی خفیہ خوشی منائی جا رہی ہے۔ امریکہ کی آبادی میں مسلم امیگرینٹس کی تعداد چودہ فیصد ہے جو کہ ظاہر ہے ایک دم سے کہیں غائب تو نہیں ہو سکتی تھی، بس تھوڑی دیر کو نظروں سے اوجھل ہونے کی کوشش میں گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔

غیر قانونی تارکین وطن یعنی Illegal امیگرنٹس کی زیادہ کمبختی آئی۔ امریکہ کے پٹرول پمپوں، ریستورانوں، سٹورز یا سٹریٹ Vending کام میں زیادہ تر پاکستانی غیر قانونی طور پہ ملازمت کرتے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ ان کے پاکستانی مالکان اپنے ہم وطنوں کو ہی ملازم رکھتے ہیں کیونکہ امریکن ایمپلائز کی نسبت یہ زیادہ جانفشانی اور تندہی سے کام کرتے ہیں۔ ہر طرح کے حالات میں کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور امریکن ورکرز کی طرح نخرے نہیں اٹھواتے۔ مشینوں کی طرح ہر وقت چالو رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے ایمپلائر کو بھی انڈر دی ٹیبل تنخواہ دے کر ٹیکس چھوٹ لینے میں آسانی رہتی ہے کیونکہ وہ اپنی صحیح آمدن شو ہی نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کے تعاون سے دونوں پارٹیوں کا کام چلتا رہتا ہے اور دونوں کو فائدہ رہتا ہے۔

گیارہ ستمبر کے بعد امیگریشن ڈیپارٹمنٹ نے جگہ جگہ چھاپے مار کر غیر قانونی تارکین وطن کو پکڑ کر جیلوں میں بھرنا اور ڈی پورٹ کرنا شروع کر دیا۔ ایکسپائر شدہ ویزے، سٹوڈنٹ ویزے، چیک ہونے لگے۔ گھروں میں فاقے آ گئے اور لوگ ادھر ادھر بھاگ کر چھپنے لگے۔ کئی کو القاعدہ کے ممبر ہونے کے شبے میں جیل میں ڈال دیا

گیا۔ ہمارے ایک جاننے والے صاحب لانگ آئی لینڈ کی کسی فرم میں انجینئر تھے مگر تھے غیر قانونی۔ انہیں جب ایف بی آئی نے پکڑا تو گھر جانے کی اجازت دیئے بغیر سیدھے اٹھا کر جیل لے گئے۔ ان کی بیوی اور بچی گھر پہ انتظار کرتی رہ گئیں۔ ہفتہ میں انہیں ایک collect کال کی اجازت دی گئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کا اور دیگر پاکستانی ساتھیوں میں سے کسی کا بھی جیل میں مورال ڈاؤن نہیں ہوا۔ ان سب نے ایک منظم گروپ بنا لیا اور باقاعدہ جیل میں باجماعت نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ جب انہیں پاکستان ڈی پورٹ کیا گیا تو وہ جیل سے سیدھے ایئرپورٹ لے جائے گئے۔ گھر تک آنے نہ دیا گیا۔ ان کی بیوی نے خود ہی سارا سامان سمیٹا اور پاکستان واپس لوٹ گئی۔

کاشف اپنے علاقے سٹیٹن آئی لینڈ کے convenience گروسری سے دودھ لینے گیا تو سٹور کی پاکستانی مالکہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس سے سرگوشی میں پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"جی ہاں۔" کاشف نے جواب دیا حالانکہ اس سے پہلے ان خاتون نے اس سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ "افسوس کہ تمہیں ہمارے سٹور سے دودھ نہیں مل سکتا کیونکہ ہمارے دودھ سپلائر نے ہمیں دودھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ Be careful خاتون نے ہدایت کی اور کاشف کسی اور سٹور پہ دودھ لینے چلا گیا۔

ملک کے کونے کونے سے مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کی خبریں آنے لگیں تو بہت پریشانی ہوئی۔ سننے میں آیا کہ اوہائیو OHIO سٹیٹ میں امریکنوں نے ایک پاکستانی ڈاکٹر کو قتل کر دیا۔ ٹیکساس میں حجاب پہننے والی ایک مسلم لڑکی کو چند امریکیوں نے ریپ کیا اور لانگ آئی لینڈ کے ایک شاپنگ مال میں شلوار قمیض میں ملبوس ایک پاکستانی عورت پر ایک بوڑھے امریکی نے یہ کہہ کر گاڑی چڑھانے کی کوشش کی کہ تم نے میرا ملک تباہ کر دیا ہے۔" بروکلین کے لٹل پاکستان کی کئی مساجد پہ حملے ہوئے۔

ہارلم میں واقع ایک کینڈی سٹور کے پاکستانی مالک کے ایک ٹین ایج لڑکے نے مکا مار کر دانت توڑ دیے اور پوچھا "Do you feel sorry for America"

چودھری صاحب نے کہا "ہم بے گناہ پاکستانی امریکن ہیں، ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے میں ہم سب کے دلوں کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا ضرور مرا ہے۔ ہمیں بھی اتنا ہی افسوس ہے۔ ہمارا یقین کریں۔"

ٹی وی اور ریڈیو پہ ہر وقت گرما گرم بحثیں اور مذاکرے ہونے لگے۔ مسلمان سب کی نگاہوں میں آ چکے تھے اور زد میں تھے، اپنی صفائی میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ ایک مستند لیٹ نائٹ ٹاک شو Politically Incorrect میں اکثر بے لاگ بے باک گفتگو ہوتی ہے اور لوگ کھل کر بات کرتے ہیں۔ اس میں پاکستان کے مشہور و مقبول میوزک گروپ جنون کے گٹارسٹ اور کمپوزر سلمان احمد صاحب کو بات کرنے کی دعوت دی گئی۔ سلمان احمد اکثر نیویارک کے سنٹرل پارک اور دیگر مقامات پہ بھی کنسرٹس کرتے ہیں جنہیں سننے امریکی، انڈین پاکستانی ہر ملک و قوم کے لوگ آتے ہیں اور انہیں بے حد پسند کرتے ہیں۔

سلمان چونکہ ایک تعلیم یافتہ روشن خیال پاکستانی ہیں اس لیے انھوں نے امریکی ٹاک شو میزبان کے اس نظریہ کو کہ سارے مسلمان جہادی اور دہشت گرد ہوتے ہیں غلط ثابت کرنے کے لیے بہت مدلّل باتیں کیں۔ انہیں یہ بتایا کہ پاکستان میں ہر طرح کے لوگ ہیں، میانہ روی رکھنے والے بھی ہیں، جو میوزک اور فائن آرٹس میں دلچسپی اور لبرل سوچ رکھتے ہیں، پیار محبت کا رویہ اپناتے ہیں۔ آپ کا میڈیا ایک خاص فرقے کو پروجیکٹ اور فوکس کرتا ہے جس کا صرف ایک ہی زاویہ ہے۔ وہ سارے پاکستانیوں کو ایک سا سمجھتا ہے جو کہ غلط بات ہے۔ میزبان صاحب نے کافی درشتی سے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ مسلمان وہ ہوتے ہیں جو اونچی اونچی بلڈنگوں میں جہاز دے مارتے ہیں اور معصوم لوگوں کو بے رحمی سے موت

کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سلمان احمد کی استقامت، خوداعتمادی اور جذبہ حب الوطنی پہ میں نے دل ہی دل میں انہیں سراہا اور میرے دل نے آرزو کی کہ کاش ہمیں اپنے وطن کی نمائندگی کرنے کے لیے ایسے ہی مخلص، تعلیم یافتہ افراد ملتے رہیں تو کوئی عجب نہیں کہ ہم اپنے کلیشے منفی امیج سے نجات حاصل کر لیں۔ جنون گروپ وہ واحد میوزک گروپ ہے جسے اقوام متحدہ کے ہال میں پرفارم کرنے کے لیے بلایا گیا۔ میں تو ویسے ہی انہیں اس بات پہ شاباش کے قابل سمجھتی ہوں کہ انھوں نے علامہ اقبال اور بلھے شاہ کا عظیم کلام ہماری نئی نسل میں متعارف کرایا اور ان کی سوچ سے پہچان کروائی۔

ایک روز میرے پیار بھرے کزن شکوہ اور اس کی میٹھی سی بیوی مریم کے اصرار پہ میں ان سے ملنے ان کے گھر مین ہٹن چلی گئی۔ اپر مین ہٹن میں کولمبیا یونیورسٹی کے نواح میں واقع ان کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے علاقے میں یوں تو ہر قوم کے لوگ بستے ہیں مگر زیادہ آبادی پھر بھی کالے اور ہسپانوی لوگوں کی ہے۔ میں ان کی گلی میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ہر بلڈنگ کے صدر دروازے پہ اسامہ کی تصویر کا ایک بڑا پوسٹر لگا ہوا ہے جس پہ گندی گالیاں تحریر ہیں اور اسامہ کے سر میں ایک راکٹ میزائل گھستا ہوا نظر آ رہا ہے۔

شام ہوئی تو شکوہ نے اپنے قریبی سنٹرل پارک میں واک کے لیے چلنے کو کہا۔ نیویارک ویسے بھی پیدل چلنے کے شوقین لوگوں کا شہر ہے لہٰذا ہم تینوں اپنے جوگرز پہن کر سیر کو چل دیے۔ کولمبیا یونیورسٹی کی عظیم الشان، پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر مجھے اپنے پرانے دن یاد آ گئے۔ مجھے کولمبیا یونیورسٹی میں پڑھنے کا کتنا شوق تھا، مگر شادی شدہ زندگی کی مجبوریاں آڑے آ گئیں اور میرا اس باوقار درسگاہ سے علم کے موتی چننے کا خواب ادھورا رہ گیا۔

پارک میں واک کرتے ہوئے ہم تینوں آپس میں گپیں لگاتے ہنسی مذاق کرتے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک سیاہ فام لڑکے نے ہمارے درمیان سے تیزی سے

سائیکل گزاری۔ ہم بمشکل ہی بچے' یہ دیکھ کر شکوہ کو غصہ آ گیا اور وہ لڑکے کے پیچھے لپکا۔ ہم نے اسے سمجھایا کہ لڑکے کے پیچھے نہ جائے حالات اچھے نہیں مگر شکوہ نہ مانا اور یہ کہتے ہوئے بھاگا کہ میں اسے ٹھیک کر کے رکھ دوں گا۔ شکوہ چونکہ ماشاءاللہ کافی لحیم شحیم ہے اس لیے کالے لڑکے نے اسے دیکھ کر دوڑ لگا دی اور غائب ہو گیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا مگر اس سے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ امریکی معاشرے میں ہم براؤن لوگوں کے لیے اب احتیاط سے رہنے کا زمانہ آ گیا تھا۔ پہلے کی طرح ہم اپنے آپ کو امریکی شہریوں کے برابر سمجھتے ہوئے اس اعتماد سے باہر چل پھر نہیں سکتے تھے۔

سِکھ بھائیوں کی بھی اچھی خاصی شامت آ گئی۔ ڈاڑھی اور پگڑی کی وجہ سے کئی جگہوں پہ انہیں طالبان سمجھ کر پیٹ ڈالا گیا۔ اسی غلط فہمی سے بچنے کے لیے کئی سکھ گروسری سٹورز پہ اس قسم کے نوٹس لگے دیکھے "ہم سکھ امریکن ہیں۔ ہمیں نیویارک ٹریجڈی کا بہت دکھ ہے۔ ہمیں امریکہ سے محبت ہے" وغیرہ وغیرہ۔ کئی کالجوں میں بھی سکھ طالب علموں کو اس قسم کے واقعات پیش آئے۔ مجھے اپنی بیٹی سمی کی فکر ہوئی جو بفلو کی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ میں اسے اکثر پوچھتی رہتی کہ اسے کسی نے کیمپس پہ تعصّب کی وجہ سے کچھ کہا تو نہیں۔

ایک روز سمی کہنے لگی "امی میرے کالج میں ایک انڈین لڑکا پڑھتا ہے جو اکثر کھانے کے وقت کیفے ٹیریا میں آ کر مجھ سے بات چیت کی کوشش کرتا ہے مگر میں اسے لفٹ نہیں دیتی جس پہ وہ چڑا رہتا ہے۔ جب سے گیارہ ستمبر کا واقعہ ہوا ہے وہ مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ کل اس نے پھر ایک بار میری ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ میں نے انکار کر دیا تو جل بھن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری طرف دیکھ کر غصے سے بولا Terrorist اور چل دیا۔" میں اور سمی اُس بات پہ دیر تک ہنستے رہے۔

☆☆

بالٹی مور میری لینڈ میں میرے بھائی ہمایوں کے گیس سٹیشن پہ کراچی کا ایک نوجوان عفان کام کرتا تھا جو کئی دوسرے پاکستانی نوجوانوں کی طرح سٹوڈنٹ ویزے پہ آیا اور اِدھر اُدھر جاب کر کے اپنی گزراوقات کرلیا کرتا تھا۔ عفان بہت سیدھا اور بھولا لڑکا ہے۔

گیارہ ستمبر سے پہلے کی بات ہے، اس کی بلڈنگ میں رہنے والی ایک بوڑھی ہمسائی نے اس سے کہا کہ میں نیویارک جا رہی ہوں۔ عفان نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا ''نیویارک مت جاؤ کہیں اور چلی جاؤ وہاں جرائم بہت ہوتے ہیں۔'' خاتون نے کہا ''نہیں میں نے تو پلان بنایا ہوا ہے میں تو ضرور جاؤں گی۔''

''جاؤ تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔'' عفان نے ایک ''بونگی'' ماری اور بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ بڑھیا نیویارک گئی اور خیریت سے واپس بھی آ گئی مگر اسے عفان کی بات یاد رہ گئی۔ جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا حادثہ ہوا تو اسے ایک دم خیال آیا کہ آخر اس براؤن جلد والے لڑکے نے مجھے نیویارک جانے سے روکا کیوں تھا؟'' اماں جی نے جھٹ ایف بی آئی کو فون کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں سوٹڈ بوٹڈ ایف بی آئی والے آئے اور عفان کو گرفتار کر کے لے گئے۔ عفان نے لاکھ کہا کہ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی، جنرل سی بات کی تھی، مگر ایف بی آئی نے سوچا کہ آخر اسے کیسے پتہ تھا کہ ان دنوں نیویارک جانا خطرناک ہوسکتا ہے۔ کچھ نہ ثابت ہونے پہ عفان کو چھوڑ دیا گیا مگر اس کی ہلکی پھلکی نگرانی شروع ہوگئی۔

عفان جب بھی میرے بھائی کے گھر ملنے آتا تو اسے سب چھیڑتے کہ ''وہ دیکھو عفان 'ایف بی آئی' والا درخت کے پیچھے سے تمہیں چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ تمہارے

پیچھے پیچھے ایک گاڑی بھی ڈرائیور وے میں آئی تھی'' وغیرہ وغیرہ۔ اسی گھبراہٹ میں ایک دن عفان آیا تو دیکھا کہ اسی گھبراہٹ میں اس نے اپنے سر کے بال سنہری کروا لیے ہیں۔ گوراچٹا تو وہ پہلے ہی تھا' اس کا خیال تھا بالوں کا رنگ بدلانے سے وہ کم دیسی لگے گا۔ بے چارے کا سب نے خوب مذاق اڑایا مگر وہ اپنی جگہ سچا تھا۔ کسی مصیبت میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔

جہاں ایسی باتیں ہوئیں وہیں اس کے برعکس واقعات بھی ہوئے جن کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگا۔ میرا بھائی بالٹی مور میں کئی سالوں سے گیس سٹیشن کا بزنس کرتا ہے اور اس نے اس شہر میں اپنی ایک ساکھ بنائی ہوئی ہے۔ اُس کے علاقے کا پادری کئی بار اس کے پاس آیا اور پوچھا کہ اسے کسی نے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟ ہمایوں کے ایک کسٹمر نے بتایا کہ کسی نے اسے اس کے گیس سٹیشن سے گیس لینے سے منع بھی کیا تو اس پر اسی امریکن کسٹمر نے کہا کہ ''میں اس شخص کو بہت سالوں سے جانتا ہوں یہ اچھا آدمی ہے۔ میں اسی سے گیس لیتا رہوں گا۔'' ہمایوں احمد بشیر کا بیٹا ہے اسی وجہ سے کافی جوشیلا اور اپنا سچ بیان کرنے میں بے باک آدمی ہے۔ وہ اکثر لوکل ریڈیو سٹیشن کے کال ان پروگراموں میں کال کر کے اپنا اظہار خیال کرتا رہتا ہے۔

گیارہ ستمبر کے بعد ایک روز ریڈیو پہ اسی طرح ایک ٹاک شو چل رہا تھا جس کے شرکاء مسلمانوں پہ خوب لعن طعن کر رہے تھے۔ ہمایوں نے فون کر کے کہا کہ ''آپ کو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ امریکہ آپ لوگوں سے زیادہ میرا ملک ہے کیونکہ میں نے اپنے اور اپنی فیملی کے لیے اس کا انتخاب خود کیا ہے۔ آپ کی طرح یہ مجھے ورثہ میں نہیں ملا' مگر آپ کو تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھانا چاہتا ہوں۔ امریکہ پاکستان کو ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے اور پھر ضرورت ختم ہو جانے کے بعد ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیتا ہے۔'' ایسی باتیں سن کر ریڈیو والے بہت جز بز ہوئے اور ہنگامہ بپا

ہو گیا کہ کون ہے جو سلطنت میں ایسی نازیبا بات کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ہمایوں نے چونکہ پے فون سے فون کیا تھا لہٰذا اس کی کال ٹریس نہ ہو سکی اور یوں اس کی بچت ہو گئی مگر کم از کم اس نے اپنے دل کی بھڑاس تو نکال لی۔

پاکستان کے صدر مشرف نے جب امریکہ کی حمایت میں تعاون کا اعلان کیا تو پاکستان کی جہادی تنظیموں کے ارکان خوفناک انداز میں دھاڑتے' سڑکوں پہ نکل آئے اور امریکہ کے خلاف بولنے لگے۔ روز ٹی وی پہ امریکی جھنڈے اور صدر بش کے پتلے جلائے جانے کے سین دکھائے جاتے تو ہم پاکستان کی خیر کی دعائیں مانگتے۔ امریکہ بہادر سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ہم جیسے چھوٹے اور کمزور ملک کو بھی نہ چبا ڈالے۔

میرے بیٹے کاشف کا ایک کالا دوست گیری اکثر اس سے حالات حاضرہ پہ بات چیت کرتا اور دونوں تازہ ترین خبروں پہ تبصرہ کرتے۔ کاشف نے اسے بتایا کہ دیکھو پاکستان امریکہ کا دوست ہے' رجعت پسند نہیں' یہ آگ لگانے' ٹائر جلانے والے مولوی ہی صرف پاکستان نہیں۔ پاکستان میں دوسری طرح کی سوچ رکھنے والے بھی موجود ہیں۔ ایک روز ٹی وی پہ اسی طرح کا ایک جہادی لوگوں کا چیختا چلاتا مظاہرہ دیکھ کر گیری بڑی معصومیت سے بولا۔ "تم تو کہتے ہو پاکستان امریکہ کا دوست ہے۔"

"But These People dont look so friendly to me"

ایک وقت تھا جب امریکہ کے صدر کو پاکستان کے صدر کا نام تک نہ آتا تھا اور اب مشرف صاحب اور بش صاحب ہم نوالہ و ہم پیالہ بن چکے تھے۔ ہر امریکن کی زبان پہ پاکستان اور مشرف کا نام تھا کیونکہ پاکستان امریکہ کی مدد کر رہا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب پاکستان کی خبر اخبار میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی تھی اور آج پاکستان پاکستان ہو رہی تھی۔

نوکری نہ ہونے کی وجہ سے کاشف کو اب ہر صورت نیویارک چھوڑنا تھا اس لیے ہم

دونوں ماں بیٹے نے بالٹی مور شفٹ ہو جانے کی سوچی۔ وہاں کاشف کا ماموں تھا اور ہمیں امید تھی کہ کاشف کو گیس سٹیشن بزنس سیکھنے کا موقع مل جائے گا تو اس کے لیے آسانی رہے گی۔ ہم اس کے سیٹ ہو جانے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

ہم نے بالٹی مور میں اپارٹمنٹ ڈھونڈا تو اس وقت تک ہمیں علم نہ تھا کہ وہ اپارٹمنٹ کمپلیکس زیادہ تر کالے لوگوں کا ہے۔ میں نے تو کچھ عرصے بعد پاکستان چلے ہی جانا تھا مگر میں اپنے بیٹے کے لیے کچھ فکر مند ہو گئی۔ کالوں کا علاقہ اور پھر بالٹی مور میں تو یوں بھی کرائم ریٹ امریکہ کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ''یا اللہ خیر'' میں نے اپنے بچے کی خیریت کے لیے دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ ویسے بھی کاشف نے اکیلے رہنا تھا اور اب جوان ایشیائی نوجوانوں کی حرکات و سکنات پہ خاص طور پہ نظر رکھی جانے لگی تھی۔

ہم سامان شفٹ کر رہے تھے کہ اوپر کی سیڑھیوں سے ایک درمیانی عمر کا کالا شخص نیچے اترتا نظر آیا۔ ''ارے آپ لوگ یہاں شفٹ ہو رہے ہیں؟ میں آپ کا ہمسایہ ہوں۔ آپ دونوں خود ہی سامان اٹھا رہے ہیں مجھے پتہ ہوتا تو میں آپ کی کچھ مدد کر دیتا۔'' وہ اپنائیت سے مسکرایا' میرے دل کو کچھ ٹھنڈ پڑی کہ یہاں میرے بیٹے سے کوئی تعصّب نہیں برتے گا اور اسے اچھے ہمسایوں کا ساتھ نصیب ہو گا۔ سامان اٹھاتے ہوئے اپنا غریب گندا مندا پاکستان یاد آ گیا جہاں گھر شفٹ کرنے کے لیے بے شمار لوگوں کی با آسانی مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ امریکہ میں اتنی مزدوری اور محنت کرنا پڑتی ہے کہ پاکستان کے نوکروں سے ملنے والے آرام کی عیاشی یاد آنے لگتی ہے۔ یہ میرے وہی بچے تھے جنہیں نوکر کمروں میں ٹرے لگا کر کھانا پہنچایا کرتے تھے اور آج وہ امریکہ کی آدم منڈی کے عام سے مزدور اور مجبور زندگی گزار رہے ہیں۔ میں بطور ماں ان کے لیے مزید کوئی آسانی نہیں پیدا کر سکتی۔

امریکن قوم بڑی بے نیاز قوم ہے۔ اپنی دھن میں مست' اپنی روٹین زندگی میں مصروف' اپنے کام سے کام رکھنے والی۔ عام امریکیوں کو ہماری طرح سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ اپنی حکومت کی غیر ملکی پالیسیوں' دنیا میں دراندازی مداخلت اور دھاندلیوں کا علم ہے یا ان سے کوئی غرض۔ وہ نائن ٹو فائیو جاب کر کے گھر آتے ہیں۔ شام کو ڈنر کھایا' برتن دھوئے' ٹی وی دیکھا اور سو گئے۔ ویک اینڈ پہ گھر سے نکل کر سودے خریدے' تفریح کی' شراب پی' ساحل سمندر پہ نہائے' لانڈری کی' گھر صاف کیا اور پھر چل سو چل۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ فراوانی کا ملک ہے چین کی بنسری بجتی ہے۔ بھوک افلاس' بنیادی ضروریات سے محرومی' بلوں کی دہشت وغیرہ جیسی باتوں کا وہاں کوئی تصور نہیں۔ امریکی ایماندار' پرخلوص اور نرم طبع لوگ ہیں۔ جو اوصاف مسلمانوں میں پائے جانے چاہئیں وہ ان میں موجود ہیں مگر سبھی گوری قومیں بھی ایسی نہیں ہیں۔

ایک بار پیرس میں ہم لوگ راستہ بھول گئے۔ اجنبی شہر تھا اور زبان بھی نہ آتی تھی۔ جب کسی مقامی آدمی یا عورت سے رہنمائی مانگنے کی کوشش کی تو انھوں نے ہمیں مکمل طور پہ نظر انداز کر کے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ فرنچ لوگوں کے بارے میں یہ بات کنفرم ہے کہ اگر آپ ان سے فرانسیسی نہ بولیں تو وہ آپ کو گھاس نہیں ڈالتے۔ ہم ریستوران گئے تو مینیو سمجھنے میں از حد دشواری پیش آئی کیونکہ سب کچھ فرنچ میں لکھا ہوا تھا اور بیرا سمجھانے کی مصیبت میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے ہم نے کیا منگوایا اور کیا کھایا۔ آلو کہ جگہ الوّ سے پیٹ بھرا۔ پتہ نہیں......

اس کے برعکس اگر آپ امریکہ میں کسی شاہراہ پہ راستہ بھول جائیں تو امریکن لوگ پاکستانیوں کی طرح اپنے سارے کام چھوڑ کر مسکرا کر آپ کو راستہ بتائیں گے۔ آپ صنف نازک ہیں تو عین ممکن ہے آپ کو گھر تک ڈراپ کرنے کی پیشکش بھی کر دیں۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے کے دو ہفتوں بعد نیویارک کے Yankee

stadium میں مرنے والوں کی یاد میں ایک پروقار سوگوار تقریب منعقد ہوئی جس میں ہر مذہب کے نمائندہ افراد کو بلایا گیا۔ایک بلیک مسلم شخص نے جب اذان دی اور سورۃ رحمان سنائی تو پورا اسٹیڈیم اس کی آواز اور حُسنِ ادائیگی سے سحر زدہ سا ہو گیا۔اس نے بلاشبہ حضرت بلال کی یاد تازہ کر دی۔مشہور یہودی امریکی سنگر خاتون Bette midler نے جب ''یو آر مائی ہیرو'' گایا تو مرنیوالوں کے لواحقین اور دوستوں پہ رقت طاری ہو گئی اور وہ اپنے ہاتھوں میں اپنے پیاروں کی تصاویر کو سینوں سے بھینچ کر زار وقطار رونے لگے۔انسانیت کی موت ہمیشہ ہی دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔میری بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

حادثۂ نیویارک کے بعد پورے امریکہ میں جذبہ حب الوطنی ایک نئے جوش و ولولہ سے ابھر کر سامنے آیا۔God Bless America اور اسی قسم کے قومی ترانے یوں گونجنے لگے جیسے ہمارے پاکستان میں وقت جنگ و مصیبت ''جاگ اٹھا ہے سارا وطن'' کی تانیں سنائی دینے لگتی ہیں۔سڑکوں پہ جگہ جگہ نسلی منافرت میں لتھڑے اس قسم کے سلوگن بھی دیکھنے میں آئے۔

Islamic Scums go back.

USA- Love it or leave it.

ورلڈ ٹریڈ سنٹر ریلیف فنڈ میں مولانا ایدھی نے بھی پاکستانیوں کی طرف سے اظہار ہمدردی کے طور پہ رقم جمع کروائی۔ایک پاکستانی نوجوان لڑکی متاثرین کے لیے خون دینے لائن میں لگی تو اسے کسی نے غصے میں آ کر شوٹ کر دیا۔

شکاگو میں تیس برس سے رہائش رکھنے والے معروف پاکستانی شاعر افتخار نسیم نے امریکہ میں ایشیائی لوگوں کے لیے بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی جو ۳۱ اکتوبر کو منائے جانے والے سالانہ تہوار Halloween کے حوالے سے

تھی۔اس شام امریکن بچے ہمسایوں کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر ان سے کوئی نہ کوئی ٹریٹ کینڈی، پھل، تحائف وصول کرتے ہیں اور انہیں اپنے فینسی ڈریس سے محظوظ کرتے ہیں۔جب میرے بچے چھوٹے تھے تو میں بھی انھیں الٹے سیدھے کپڑے پہنا کر دیگر امریکی بچوں کے ساتھ بھیجا کرتی تھی اور مجھے خود بھی اس تہوار میں بڑا مزہ آتا تھا۔افتخار نسیم کی نظم میں بھی اسی دکھ کا تذکرہ ہے کہ چونکہ اب میں امریکیوں کو براؤن کلر کا ایشیائی نظر آنے لگا ہوں اس لیے اب ان کے دل میں میرے لیے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔تیس برس یہاں گزار لینے کے باوجود میں ابھی تک امریکی نہیں سمجھا جاتا۔نظم کی کچھ سطور یوں ہیں:

WHY CHILDREN DONT KNOCK ON MY DOOR
MY MONEY JAR FULL OF QUARTERS
LOOKED SO EMPTY, WHAT HAPPENED
THIIRTY ONE YEAR AS A LAW ABIDING CITIZEN
I AM STILL A FORIEGNER
MY COLOR TWO SHADE DARKER THAN AN
AVERAGE WHITE MAN
GO BACK TO YOUR COUNTRY
THEY YELL AT ME
AND I AM A CITIZEN OF USA
WITH NO COUNTRY

☆☆

امریکیوں میں اسلام کے بارے میں تجسس بہت بڑھ گیا اور بک سٹوروں میں

اسلام سے متعلق کتابیں دھڑا دھڑ بکنا شروع ہوگئیں۔لوگ حیران تھے کہ یہ کیسا مذہب ہے جس کے دیوانے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔موت جن کے لیے خوف کا استعارہ نہیں۔محض ایک دوسرے جہان میں داخلے کا دروازہ ہے' ان کے مشن کا ایک ضروری حصہ ہے۔امریکہ کی موجودہ نسل نے چونکہ اپنے ملک میں کبھی اس قسم کی تباہ کاری اور بے سکونی نہ دیکھی تھی' نہ ہی ایسی شکست کا سامنا کیا تھا لہٰذا وہ ہل کر رہ گئی۔یکا یک کرائم ریٹ نیچے آ گیا۔شاید چور اُچکوں کو بھی یہ سوچ کر ترس آ گیا تھا کہ لوگ غمزدہ ہیں انھیں کچھ دیر کے لیے اور پریشان نہ کیا جائے۔مسلمانوں میں تو ایک دوسرے کو برادر کہنے کی روایت موجود ہے مگر مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ امریکنوں نے بھی غم کی اس گھڑی میں ایک دوسرے کو برادر کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔

حادثے کے بعد نیویارک سٹی میں کام کرنے والے سینکڑوں پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کے روزگار پہ بہت اثر پڑا۔لوگ ان کی ٹیکسیوں میں سفر کرنے سے گھبرانے لگے اور وہ سٹیرنگ پہ ہاتھ دھرے' مسافروں کے انتظار میں حیران پریشان بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔میئر جولیانی نے ان کے مسائل کو صحیح معنوں میں سمجھتے ہوئے انھیں بیروگار الاؤنس دلوائے تاکہ ان کے کچن چلتے رہیں۔امریکی حکومت نے حادثے میں جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین کو ایک ایک لاکھ ڈالر معاوضہ دیا جس نے یقیناً ان کے زخموں پہ کسی نہ کسی حد تک مرہم رکھنے کا کام ضرور کیا ہوگا۔

لاہور میں میری بہن سنبل کی ملازمہ کا منگیتر بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں فوت ہوگیا تھا۔ سننے میں یہی آیا کہ امریکی حکومت نے اس کے بھائی کو لاکھ ڈالر مع امریکی امیگریشن پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سیدھا امریکہ پہنچ گیا۔امریکہ جیسا بھی ہے بُرا ہے بھلا ہے دنیا کے لوگوں کا ڈریم لینڈ ہے کیونکہ لینڈ آف

oppurtunity ہے۔آپ محنت کرنا جانتے ہوں تو آپ کو اس کا پھل ضرور دیتا ہے۔ امریکہ کے ویزے کے لیے لوگ لاکھوں روپے خرچتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی تک لگا دیتے ہیں۔اس لیے جسے جیسے ہی ویزا ملتا ہے وہ پرواز کر جاتا ہے۔

آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے کا واقعہ مجھے آج تک نہیں بھولا جب ایک ایرانی نوجوان نے ایران سے اپنی بیوی کو امریکہ لانا چاہا مگر اسے ویزا نہ ملا۔اس نے اپنی نوبیاہتا کو ایک بڑے سے سوٹ کیس میں بند کر کے جہاز میں لدوا دیا۔اس کا خیال تھا یوں وہ چپکے سے امریکہ پہنچ جائے گی مگر جب سوٹ کیس کھولا تو بیوی کو مردہ پایا۔اس صدمے سے نوجوان سنبھل نہ سکا اور اس نے اپنی زندگی بھی ختم کر ڈالی۔

اور ابھی دو تین برس قبل نیویارک میں ہونے والا ایک واقعہ بھی اخبارات کی زینت بنا رہا۔ ہوا یوں کہ چین سے آنے والے ایک مال بردار جہاز کے لنگر انداز ہونے سے پہلے ہی اس کے چینی ملازمین نے ہڈسن دریا میں چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ کچھ کو تو کنارے پہ پہنچنے سے پہلے ہی پولیس نے پکڑ لیا مگر کچھ فرار ہونے میں کامیاب ہو ہی گئے۔امریکہ کی دھرتی پر قدم رکھنا ان کے لیے کتنا ضروری تھا کہ اس کے لیے وہ جان پہ بھی کھیل گئے۔

چند برس قبل پاکستان ڈے پہ پاکستان سے آنے والے سرکاری فوجی بینڈ کے کچھ ارکان بھی نیویارک کے میڈیسن ایونیو کی پریڈ پہ بینڈ بجانے کے بعد ایسے غائب ہوئے کہ ان کا سراغ ہی نہ ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کا داؤ لگا وہ امریکہ ضرور پہنچا اور ''مفت'' کی روٹی اور ایک باقاعدہ زندگی کی خواہش میں امریکہ میں اپنا گھر بنانے کی کوشش ضرور کی۔ ہر سال آٹھ لاکھ لوگ قانونی اور چودہ لاکھ غیر قانونی طریقوں سے امریکہ میں داخل ہوتے ہیں۔

مجھے نیویارک میں رہنے والے ایک افسانہ نگار کا وہاں کے حلقہ اربابِ ذوق میں پڑھا ہوا ایک افسانہ کبھی نہیں بھولے گا جس میں انھوں نے نیویارک میں رہنے والے غریب ملکوں کے امیگرنٹس کو حشرات الارض سے تشبیہ دی ہے۔ ان کی کہانی کے مناظر میں سیکنڈ اور تھرڈ کلاس شہری جیسی زندگی گزارنے والے یہ کیڑے مکوڑے روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں اپنے اپنے بلوں سے نکلتے' رزق تلاش کرتے اور پھر دوبارہ اپنے اندھیرے بلوں میں گھس کر غائب ہو جاتے ہیں۔ صرف اس یقین پہ جیئے چلے جاتے ہیں کہ اس بڑے شہر میں انہیں کم از کم اپنا روز کا رزق تو نصیب ہوتا رہے گا۔ زندگی کا پہیہ تو چلتا رہے گا۔ یہ گارنٹی انہیں ان کے اپنے ملکوں میں بھلا کب اور کہاں نصیب ہوتی ہے؟

سانحۂ نیویارک کے بعد دنیا کے بہت سے ملکوں کے سفیر اور تاجدار' جائے واردات پر افسوس کے لیے گئے۔ ایک سعودی شہزادے نے نیویارک کو سنبھلنے کے لیے کئی ملین ڈالر کی رقم پیش کی لیکن جب اس نے چڑ مڑ ہوئے سٹرکچر سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر یہ کہہ دیا کہ اب امریکہ کو اپنی خارجہ پالیسیوں پہ نظر ثانی کرنا ہوگی' تو میئر جولیانی اور صدر بش بگڑ گئے اور شہزادے کی امداد کو نو تھینکس کہہ کر لوٹا دیا۔ میں نے سوچا اگر اس عربی شہزادے کے پاس امریکہ کو دینے کے لیے پیسہ ہے تو وہ اسے کسی مسلمان غریب ملک کو کیوں نہیں دے دیتا جو اس کی امداد کا یقیناً زیادہ مستحق ہوگا۔ آ جا کے لاڈ بھی امریکہ کے ہی کیے جاتے ہیں۔ رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر......

جیسا کہ عام طور پر کرائسس کے دنوں میں ہوتا ہے۔ ان دنوں نیویارک (اور مجھے یقین ہے دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی) کئی قسم کی افواہیں گردش کرنے لگی تھیں۔ ایک بات جنگل کی آگ کی طرح چارسو پھیل چکی تھی کہ حادثہ کے دن ان

عمارات میں کام کرنے والے چار ہزار یہودی افراد اپنی جاب سے غیر حاضر تھے۔ میڈیا نے کئی بار وضاحت کی کہ یہ افواہ جھوٹی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ٹی وی پہ دکھائے جانے والے جنازوں میں سے بہت سے یہودیوں کے جنازے ہم نے بھی دیکھے جن کی آخری رسومات ان کے مذہبی عقائد کے مطابق ادا کی جا رہی تھی۔ پاکستانی نوجوان ٹریڈر تیمور کے جنازے پر ان کے بہت سے یہودی کولیگ ساتھی ٹریڈرز اظہار افسوس کے لیے آئے۔ ان کے لیے Eulogy یعنی خطبہ وفات بھی ایک یہودی دوست نے پڑھا جس پر سب کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

حادثے کے روز نیویارک فائر ڈیپارٹمنٹ والوں کا ایک تربیتی فلم عملہ اتفاقاً فلمبندی کے لیے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ فلم کے ڈائریکٹر اور ان کے بھائی نے جب قیامت ٹوٹتے دیکھی تو بوکھلا گئے مگر ہر طور پر کیمرہ چلتے رہنا دیا۔ یہ فلم بعد میں HBO نے ریلیز کی جو ہم نے ٹی وی پر دیکھی۔ اس میں ایسے ایسے عجیب خوفناک مناظر اور آوازیں ہیں کہ روح دہل کے رہ جاتی ہے اور یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے! ہڑبونگ کے دوران دونوں بھائی بچھڑ گئے اور دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں یہی سوچ لیا کہ شاید وہ اب نہیں رہا مگر جسے اللہ رکھے...... حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ دونوں بھائی آخر میں مل گئے اور آنسوؤں سے ایک دوسرے کا اسقبال کیا۔ دیکھنے کے لیے دنیا کو ایک انوکھی فلم دینے میں کامیاب ہو گئے۔ پھنسے ہوئے لوگوں کے جلتی ہوئی عمارات سے چھلانگیں لگانے کے بہت سے اذیت ناک مناظر کے بیچوں بیچ ایک منظر یہ بھی تھا کہ راکھ اور ملبے کی بارش کے باوجود wtc کے کسی ریستوران میں رکھا ہوا سفید رنگ کا چائنہ ٹی سیٹ کسی خراش کے بغیر محفوظ نظر آ رہا تھا۔ بھگدڑ افراتفری اور ہولناک مناظر کے درمیان یہ ٹھہراؤ والا سین یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آگ اور شعلوں سے بھرے دریا میں استقامت اور خوبصورتی سے کھلا ہوا کنول کا

ایک پھول تیرتا جارہا ہو۔ایک منظر یہ بھی تھا۔

عمارت کی اوپری منزل پہ آگ لگ چکی ہے کسی منزل سے ایک لفٹ نیچے جانے کو تیار ہے۔جس میں سوار ہونے کو منتظر درجنوں بے چین، خوفزدہ لوگ کھڑے ہیں۔ پھر جب لفٹ کا دروازہ کھلتا ہے تو بڑی عمر کے کچھ لوگ دانستہ اور ارادتاً یہ کہہ کر پیچھے رک جاتے ہیں کہ ''جوان لوگوں کو پہلے جانے دو۔''لفٹ نیچے چلی جاتی ہے اور پیچھے رہ جانے والے لوگ ہونی اور ان ہونی کے بیچ لٹکے اپنے مقدر سے بے خبر راضی بر ضا وہیں کے وہیں کھڑے رہ جاتے ہیں۔ایسے مناظر دیکھ کر دل کو پھر سے یقین ہو جاتا ہے کہ انسان کے اندر وحشی پن کے ساتھ ساتھ انسانیت بھی کسی نہ کسی طور ضرور چپکی رہتی ہے۔وہ کبھی اس سے علیحدہ نہیں ہوسکتی۔کوئی انسانوں کی ہستی مٹا رہا ہے، انہیں ملیامیٹ کر رہا ہے تو کوئی اپنی زندگی کے سانس دوسروں میں بانٹ رہا ہے تاکہ زندگی کا جام ان کی جگہ وہ پی لیں۔سفر جاری رہے اور شمعیں جلتی رہیں۔

سنا ہے ایک ٹاور میں موجود ایک پاکستانی نوجوان کو اِدھر سے اُدھر بھاگتے دیکھ کر لوگوں نے دہشت گرد سمجھ کر چیخیں مارنا شروع کر دیں حالانکہ بعد میں پتہ چلا کہ اس نے کئی لوگوں کو موت کے منہ سے بچایا لیکن خود لقمہ اجل بن گیا۔

حادثے کے تقریباً ایک ماہ بعد حالات کچھ سنبھلنا شروع ہو چکے تھے۔فلائیٹس دوبارہ رواں ہو چکی تھیں اس لیے سنبل نے تو ایک پل ضائع کیے بغیر پہلی ہی فلائٹ پکڑی اور لاہور روانہ ہوگئی۔ہم نے بھی اسے سوار کروا کر سکھ کا سانس لیا کیونکہ وہ اپنے بال بچوں سے دوری کی وجہ سے بہت گھبرا گئی تھی۔اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ جس رات وہ گئی اسی رات امریکہ نے پہلی بار افغانستان پہ بمباری کی جس کی وجہ سے پی آئی اے کو دبئی کا چکر کاٹ کے جہاز کو کراچی اتارنا پڑا۔فضائی حدود اب محفوظ نہ رہی تھیں، لہٰذا ہم سب بہت فکرمند تھے۔سنبل پاکستان خیریت سے پہنچی تو خدا کا شکر ادا کیا اور

شکستہ عمارات

قریبی عمارات بھی دھماکے سے چوراچور ہو گئیں

علامتی ڈھانچہ

صلیب کی شکل میں بچ جانے والے سٹیل بیم کے ڈھانچے پر پادری برائن جارڈن دعائیں پڑھ رہے ہیں

میں اس کی ذمہ داری سے آزاد ہوئی۔

سنبل کو چھوڑنے کے لیے ہم بالٹی مور سے نیویارک تو آ ہی چکے تھے تو سوچا کیوں نہ گراؤنڈ زیرو کا ہی چکر لگا کر اسے ذرا دیکھ لیں۔ گو کہ امدادی کارروائی اور صفائی کا کام ابھی جاری تھا مگر پبلک نے وہاں سے گزرنا شروع کر دیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر اپنے معمول پہ لوٹ رہی تھی۔

اس علاقے میں، میں کتنی ہی بار گھوم چکی تھی لیکن اب سب کچھ کتنا اجنبی ان دیکھا اور پراسرار لگ رہا تھا۔ سارے ایریا میں واضح تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ نہ وہ چہل پہل، نہ رونق، نہ خوش باش چہرے، نہ شہد کی مکھیوں جیسے بھنبھناتے ٹورسٹوں کے جتھے۔ حیرت اور ہیبت میں ڈوبی وال سٹریٹ چپ چاپ کھڑی آنے جانے والوں کو تکے چلی جا رہی تھی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارات کی جگہ پر ایک بہت بڑا گڑھا سا پڑ گیا تھا جسے دیکھنے سے یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں کبھی دو اتنی طاقتور عمارتیں کھڑی تھیں۔ پہلو میں بڑا سا جلا ہوا کالا بک سٹور جس میں ایک کیفے بھی تھا بھسم ہو چکا تھا۔ اس کی درزوں میں نہ جانے کتنی پیاری پیاری اور قیمتی کتابیں اور کس کس ماں کے جگر کے ٹکڑے ذرے بن کر پھنسے ہوئے تھے، اب جو بے نام اور بے ہستی تھے۔ ان دفاتر میں نہ جانے کون کون تلاش معاش میں صبح نائن ٹو فائیو کی جاب کر رہا ہو گا۔ شام کو روٹی گھر لے جاتا ہو گا تو اپنے بال بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا، ہنستا مسکراتا ہو گا۔ اب تو پورے علاقے میں زندگی کی کوئی پرچھائیں تک موجود نہیں تھی۔ ایک منحوس اداسی تھی جو اس ادھ جلی بھسم شدہ عمارت پہ بال کھولے سو رہی تھی۔ نیویارک شہرِ خموشاں بن چکا تھا۔ سکائی سکریپرز sky scrapers کے جنگل کے سب سے لمبے، اونچے اور اہم درخت جڑوں سے اکھیڑے جا چکے تھے اور اب آس پاس کی عمارات چھوٹی چھوٹی، ننگی ننگی، شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھیں۔ انسان کس قدر تخلیقی اور تخریبی قوت کا مالک

ہے۔ چاہے تو بلڈنگوں کا خوبصورت جنگل اگا لے چاہے' تو انہیں جڑ ہی سے اکھاڑ پھینکے اور نیست و نابود کر کے رکھ دے۔ انسان واقعی خدا کا نائب ہے۔ وقت آنے پر خدا ہی کی طرح با اختیار بن جاتا ہے۔

ایسی ہی جاہ و جلال والی ایک بلڈنگ شکاگو میں بھی ہے جسے ایک پاکستانی مسلمان آرکیٹیکٹ نے ڈیزائن کیا ہے۔ لفٹ میں گھسنے سے پہلے اس کے نام کی تختی دیکھ کر دل فخر سے بھر جاتا ہے کہ میرے اپنے اتنے قابل ہیں اور اتنے بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں۔ امریکہ جائز کریڈٹ دینے سے کبھی نہیں چوکتا کہ ٹیلنٹ کو وہاں ضرور عزت ملتی ہے اور اسی لیے میرے ہم وطن کا نام وہاں کندہ تھا۔

وہ شام کچھ عجیب سی تھی۔ وال سٹریٹ کی اہم نیویارک سٹاک ایکسچینج بلڈنگ کے ماتھے پہ لکھا ہوا Nasdaq سٹریٹ لائٹوں کی عدم موجودگی کے باوجود چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ ویران سڑک کے بیچوں بیچ نصب بڑا سا کالا بھینسا گھرے ہوتے اندھیرے میں بھی اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں سورۃ بقرہ والا سونے کا بچھڑا یاد آ گیا جسے اللہ تعالیٰ نے پوجنے سے منع کیا تھا مگر بہت جلدی بھول جانے والا انسان اس کا یہ حکم بھول گیا۔ اُسے خدا مان لیا اور پھر خسارے میں رہا۔ یہ کالا بھینسا بھی تو سٹاک مارکیٹ ورلڈ میں امریکہ کی طاقت کا مظہر تھا۔

امریکنوں نے بھلا اس قدر خوفزدگی کا تجربہ بھلا پہلے کبھی کہاں کیا تھا؟ وہ خوف سے نچڑ چکے تھے' گھروں سے کم ہی نکلتے تھے لہٰذا اس وقت بھی وہاں بہت کم لوگ موجود تھے۔ مدھم روشنیوں میں گھبرائے ہوئے اداس چہروں والے اِکا دُکا ٹورسٹ سڑک پہ یوں ہولے ہولے قدم اٹھا کر چل رہے تھے جیسے زندہ نہ ہوں' مرے ہوئے ہوں۔ گنگ زبان' سراسیمہ' گمشدگی کا تاثر چہروں پہ سجائے' گراؤنڈ زیرو کا' جواب بالکل

صفر ہو چکا تھا' نظارہ دیکھنے کو بے تاب اور بے چین دکھائی دیتے تھے...... پولیس نے کافی راستے بلاک کرر کھے تھے اور ہر آنے جانے والے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جارہا تھا جس سے میرے دل میں تھوڑی سی تشویش پیدا ہوئی مگر ہمیں کسی پولیس والے نے آگے بڑھنے سے نہیں روکا اس لیے ہم بھی دھیرے دھیرے جائے حادثہ کے قریب جا پہنچے۔ سڑک کے کھمبوں' لوہے کے جنگلوں حتیٰ کہ زمین پر بھی رنگ رنگ کے پھول' گلدستے' ٹیڈی بیئرز' ربن' کارڈز' گمشدہ لوگوں کی تصاویر' ان کے لیے محبت بھری نظمیں' سجی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے نفرت آمیز جملے اسامہ بن لادن کی تصاویر والے پوسٹرز' جن میں اس کے سر میں راکٹ میزائل گھستے نظر آ رہے تھے' بھی اتنے نمایاں تھے کہ ان سے نظریں چرانا ممکن نہ تھا۔ بڑے بڑے لوہے کے ٹکڑے' شیشے' جہاز کے ٹکڑوں سے لدے ہوئے ٹرکوں کی قطار اور کام کر کر کے تھکے ہوئے Hard Hat پہنے ستے ہوئے چہروں والے جینز ٹی شرٹ پہنے مزدور بھی خاموش تھے۔ کوئی کم ہی آپس میں بات کرتا نظر آتا تھا۔

☆☆

بڑے ٹی وی نیٹ ورکس مثلاً ABC, CBS, CNN وغیرہ نے وہیں اپنے عارضی ٹی وی سٹیشن قائم کر لئے تھے جہاں سے وہ مسلسل کورتج کے ذریعے دنیا کو دکھا رہے تھے کہ دیکھو یہ کیا ہو گیا ہے۔ چینی لڑکے لڑکیاں کمائی کا کوئی بھی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے' لہٰذا اس وقت بھی حالات کی مناسبت سے امریکی قومی رنگوں' لال سفید اور نیلے رنگ میں بنی خوبصورت نگینوں سے جڑی ہوئی جیولری فروخت کر رہے تھے۔ لوگ جذبہ حب الوطنی سے سرشار دھڑا دھڑ اُن سے ننھے ننھے چمکتے ہوئے امریکن جھنڈے اور Pins خرید کر اپنی قمیضوں پہ سجا رہے تھے۔ میرے ساتھ میری بھابی تھیں جو بالٹی مور سے گراؤنڈ زیرو دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بھی ایک چھوٹا سا چمکتا ہوا' امریکن جھنڈے کا نیکلس خرید کر گلے میں ڈال لیا اور یوں ہم بھی ان میں سے ہو گئے جو اس وقت صدمے سے دو چار تھے۔ خیال یہ بھی تھا کہ ''دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے'' اور ہم اس وقت اس سرزمین پہ تھے' رہنے کے لیے' جس کا انتخاب ہم نے خود اپنی مرضی سے کیا تھا۔

پیدل چلتے نظریں جب بند دکانوں کے تڑکے ہوئے شیشوں' الٹے ہوئے شو کیسوں' گرے ہوئے سامان' اوندھے پڑے ہوئے manequins پہ پڑی تو دل ایک عجیب دکھ سے بھر گیا۔ کسی بھی چیز کی ٹوٹ پھوٹ آنکھوں کو اچھی نہیں لگتی۔

کسی کیتھولک سکول کے بچے اپنی نن استانیوں کے ساتھ کھڑے مقدس گیت گا رہے تھے کہ اے خدا ہماری مدد کر۔ ہمیں پاس کھڑے ہو کر Hymns سنتے دیکھ کر ایک مسکراتی ہوئی نن نے ہمیں اپنا چرچ لٹریچر اور پھول پیش کیے جو ہم تھینکس کہہ کر پکڑ لیے۔ میرے بیٹے کا شف نے نیو یارک فائر ڈیپارٹمنٹ کے لوگو والی ایک کیپ خرید

کر سر پر اوڑھ لی۔ کاشف پیدائشی امریکی ہے، ہم امیگرنٹس Immigrants کی حیران پریشان، سیکنڈ جنریشن سے اس کا تعلق ہے۔ دو ملکوں اور دو تہذیبوں کے درمیان بٹا ہوا کاشف یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ اب ان کا اس سرزمین پہ کیا سٹیٹس ہوگا؟ اب حالات کیسے معمول پہ آئیں گے؟

میری نظر گراؤنڈ زیرو کی بغل میں موجود ایک ننھے منے چرچ پر جا پڑی جو اُجڑا اُجڑا اور ویران سا دکھائی دے رہا تھا اس کی خاموشی سوال کر رہی تھی کہ یہ انسانوں کو آخر کیا ہو گیا ہے؟ گاڈ اور اللہ کو پیار کرنے والے اس سے لاڈ کر کے مرادیں پوری کروانے والے آخر ایک دوسرے کے ساتھ پیار سے کیوں نہیں رہ سکتے؟ بابا بلھے شاہ کتنی پیاری بات کہہ گئے ہیں:

گل سمجھ لئی تے رولا کی
ایہہ رام رحیم تے مولا کی

کہتے ہیں بلاسٹ ہونے کے بعد مرنے والوں کے کپڑے، جوتے، جائے حادثہ سے تقریباً تین بلاک دور تک بکھرے پائے گئے۔ ملبے کا ڈھیر دس فٹ تک اونچا تھا اس لیے کسی بچ جانے والے کا مل جانا تقریباً ناممکن تھا۔ اس وقت نیویارک کے میئر جولیانی نے اعلان کروایا تھا کہ جن لوگوں کو عزیز و اقارب کی لاشیں یا جسم کے ٹکڑے نہیں ملے یا شناخت نہیں کیے جا سکے وہ ملبے کے ڈھیر سے کچھ راکھ، مٹی اٹھا لیں اور انہیں ہی اپنے پیاروں کی باقیات سمجھ لیں۔ چاہیں تو ان کا DNA ٹیسٹ کروا لیں کیونکہ ان پیاروں کے وجود اور ہستی کے ٹکڑوں کی آمیزش سے اب وہی خاک متبرک اور محبوب تھی، سبھی کچھ تھی۔ میئر جولیانی کا یہ فرمان اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ انسان کی طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ جب تک کسی الجھن کے منطقی انجام کو نہ پہنچ جائے، بے چین اور مضطرب رہتا ہے۔ اپنے پیارے کی مٹھی بھر نشانی بھی کسی بے قرار دل کو کچھ

سکون دے سکتی ہے' لہٰذا لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اُس مٹی کو اپنی یادوں کی قبر میں ہی دفن کر دیا کہ ان بدنصیبوں کو دفن کے لیے دو گز زمین بھی نہ ملی تھی۔

ہم گراؤنڈ زیرو سے رخصت ہوئے تو ہمارے دل بھی اُداسی سے بھر چکے تھے۔ سٹیٹن آئی لینڈ پہ فیری دوبارہ چلنا شروع ہو چکی تھی۔ مگر لوگ پہلے کی نسبت بہت کم تھے۔ دریا کنارے بہت سی موم بتیاں جل رہی تھیں جن کے اردگرد اسی طرح ربن' پھول' کارڈز بکھرے ہوئے تھے۔ پورا نیویارک ایک قبرستان لگ رہا تھا۔ پولیس والے اور فائر مین نیویارک کی کسی بھی سڑک سے گزرتے تو لوگ تالیاں بجا کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے دکھائی دیتے۔ تقریباً ہر عمارت پہ امریکی جھنڈے اور ''گاڈ بلیس امریکا'' کے بینر سجے نظر آ رہے تھے۔ امریکنوں کو میں نے اس سے پہلے کبھی اپنے وطن کی محبت میں اس طرح سرشار نہیں دیکھا تھا۔

مین ہٹن کی گلیوں سے گزرتے ہوئے میں نے شان وشوکت والی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ پہ اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تو مجھے خیال آیا اس کی سب سے اوپر کی منزل پہ ہمیشہ نیویارک میں بسنے والی اقوام کی خوشنودی کی خاطر' ان کے ملک کی سالگرہ کے حساب سے لائٹنگ کی جاتی ہے۔ برطانوی' فرانسیسی' اطالوی' ہسپانوی اور چودہ اور پندرہ اگست کو انڈیا اور پاکستان کے جھنڈوں کے رنگوں والی لائٹیں بھی دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ ہم دو ملکوں کے یوم آزادی کے احترام میں بھی ایمپائر اسٹیٹ میں اتنا خوبصورت چراغاں ہوتا ہے۔ اب پتہ نہیں ایسا ہوگا یا نہیں؟

گیارہ ستمبر کے واقعے سے پہلے ہی امریکہ میں Cair نامی تنظیم کا وجود عمل میں آ چکا تھا جس کا مقصد' مسلمانوں کو مذہبی تعصب سے تحفظ دینا تھا۔ اب تو یقیناً اس کے لیے کام بہت بڑھ گیا ہوگا۔ امریکن پوسٹل سروس نے حادثہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے پہلے عید پہ خصوصی سٹیمپ جاری کیے جنہیں دیکھ کر سب مسلمان بہت خوش ہوئے تھے کہ ہمیں

بھی نمائندگی ملی لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ اینتھر اکس کے مہلک پاؤڈر میں لتھڑے ڈاک کے لفافے وصول کرنے کے خوف سے سادہ اور خوش مزاج امریکن پوسٹ مین اور پوسٹ لیڈیز ہاتھوں پہ ربڑ کے دستانے چڑھائے گھر گھر ڈاک پہنچا رہے تھے۔ مجھے اپنا ایک پچیس تیس سال قبل والا پرانا بابا پوسٹ مین پھر یاد آ گیا جو جانتا تھا کہ میں اس کی راہ تکا کرتی تھی۔ اگر وہ نیلا خط لاتا تو میں خوشی سے بے حال ہو جاتی اور اس سے خوب باتیں کرتی۔ مگر جس روز ایسا نہ ہوتا تو وہ ہاتھ نچاتا' اپنی آنکھوں سے جھوٹ موٹ آنسو ٹپکانے کی ایکٹنگ کرتا۔ زبردستی مسکرانے کی کوشش میں میری اداس اور تنہا آنکھیں گیلی ہو جاتیں۔ اب تو پوسٹ مینوں کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ ڈاک بانٹتے وقت مشکوک لوگوں کے لیے آنکھیں کھلی رکھیں۔

اس سانحے کے بعد سے افغانستان میں شروع ہونے والی بمباری اور اس کے نتیجے میں بدلتے ہوئے حالات و واقعات کی وجہ سے امریکہ میں میرا قیام طویل سے طویل ہوتا چلا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہو جائے گا۔ بچوں کو چھوڑ کر جانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی میرے بچوں کو کچھ کہہ نہ دے' کر نہ دے لیکن شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔

میرے بچوں کی طرح امریکہ میں پیدا ہونے والے بہت سے امیگرنٹس کے بچوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میری دوست مونا شہاب اپنے ٹین ایج بچے کو سمجھا رہی تھی کہ "دیکھو بیٹا یہ امریکہ کے تکبر کا نتیجہ ہے اور اللہ کو تکبر پسند نہیں۔" لیکن امی جہاز ٹکرانے والے اپنے زندگی سے تو گئے نا۔ یہ کیسے لوگ تھے جنہیں اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں تھی؟" بچہ مزید حیران ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس بات کا اس کی امی یا کسی اور کے پاس بھی جواب نہیں تھا کہ یہ جو جان سے گزر گئے تھے جان بوجھ کر موت کے کنوئیں میں کود جانے کی جرأت کہاں سے لاتے تھے۔ میرے بھائی نے ہمیں ریاست ورجینیا

میں وہ موٹل دکھایا جہاں عطا محمد دس ستمبر کی رات کو ٹھہرا ہوا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ایک جیتا جاگتا نوجوان رات وہاں سویا۔ صبح اٹھا' نہایا دھویا' ناشتہ کیا' نیلی قمیض پہن کر فلائٹ پکڑی اور جہاز ہائی جیک کر کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں دے مارا۔ کتنا دل گردہ ہوگا اس کا۔ سننے میں آیا کہ زندگی کی آخری رات اس نے شراب خانہ میں گزاری اور کریڈٹ کارڈز پہ خوب بل چڑھائے۔ اللہ جانے کیا سوچتا ہوگا ایسا شخص جس نے اپنی موت کی گھڑی کا خود انتخاب کر رکھا ہو۔ کیسی لگ رہی ہوگی اس کو زندگی کی دم توڑتی گھڑیاں اور آخری لذتیں؟'' سوچ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے کالے سیاہ دھوئیں میں نظر آتی شیطان کی واضح شبیہ کو اپنی اپنی سمجھ کے مطابق معنی دیے جانے لگے۔ کرسچین کہنے لگے' اس قدر تباہی اور بربادی صرف شیطان ہی کا کام ہے لہٰذا اس طرح سے شیطان نے اپنے ہونے کا ثبوت دے دیا ہے۔ مسلمانوں نے کہا ان عمارات میں شیطانی کام ہو رہے تھے' دنیا کے مظلوم عوام کے حقوق غصب کیے جا رہے تھے اس لیے ہی شیطانی شبیہ کا ظہور ہوا۔

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

(علامہ اقبال)

امریکہ کے شہری یہی پوچھتے رہ گئے کہ ہم اتنے امن پسند' مدد کرنے والے' محبت کے شیدائی لوگ ہیں تو پھر ہم سے اتنی نفرت کیوں؟ ہم تو دنیا بھر کے امیگرنٹس کو گودی میں لٹا کر ان سے لاڈ کر رہے ہیں' تو ہم سے ہمارے ہی ملک میں ایسی زیادتی کیوں ہوئی؟ امریکہ ایک ترقی یافتہ' کامیاب' لیڈر شپ کوالٹی کا حامل ملک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں مگر کمزور ہمیشہ طاقتور سے نفسیاتی طور پہ نفرت کرتا ہے اور احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہے اور امریکہ کی

بدنصیبی یہ ہے کہ تمام تر فکری، سائنسی، فوجی، تکنیکی طاقت کے باوجود یہ دنیا کی محبت سے محروم ہے۔

مجھے کئی سال پہلے ٹائم میگزین میں چھپی ایک رپورٹ یاد آ رہی ہے جو لندن میں ہونے والے ایک مظاہرے کے بارے میں تھی۔ لندن میں رہنے والے ہندو پاک کے باسی، کسی متعصّبانہ واقعے کے بعد سڑکوں پہ احتجاج کر رہے تھے۔ رپورٹ کے ساتھ ایک ایسی تصویر تھی جسے میں آج تک نہیں بھلا سکی۔ تصویر میں ایک انڈین عورت نے سائن اٹھا رکھا تھا جس پہ لکھا تھا:

We are Here because you were there.

یعنی اس نے صاف صاف حساب برابر کر دیا تھا کہ تم ہم پر، ہمارے ملک پر صدیوں حکومت کرتے رہے ہو۔ اب ہماری موجودگی کو بھی بھگتو۔ اب ہمارا تمہاری سرزمین پہ آنا، رہنا، اس کے باغوں کے پھل کھانا بالکل جائز اور مناسب ہے۔ اب ہماری باری ہے۔ مجھے یہ بات بہت اچھی لگی اور مزہ دے گئی۔

ماضی میں گوروں کی اور مسلمانوں کی آپس میں صلیبی جنگیں ہوتی رہیں مگر وہ لڑائی فتوحات اور قبضوں کی تھی، مذہب کی نہیں، مگر آج افسوس کہ ہر لڑائی کی تان مذہب پہ ہی ٹوٹتی ہے حالانکہ کسی بھی مذہب کی تعلیمات میں انسان کشی اور دہشت گردی کو کبھی پسند نہیں کیا گیا۔ مذہبی تعصّب کی تاریخ کے حوالے جب ادب میں بھی ملتے ہیں تو بڑی حیرت اور افسوس ہوتا ہے کہ ادب کو تو ان چیزوں سے بالاتر ہونا چاہیے۔ میں عظیم اطالوی شاعر دانتے کا ہی ایک بار پھر ذکر کروں گی جو بڑا اکٹر عیسائی اور متعصب شخص تھا۔ اپنی شہرہ آفاق نظم Divine Comedy میں جب وہ جہنم کی سیر کو جاتا ہے تو اسے وہاں سقراط، افلاطون، قلوپطرہ، ابوسینا، ہٹلر، الکیمیا وغیرہ نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ حیرت انگیز طور پر وہاں مسجدوں کے مینارے اور اہم مسلم مذہبی شخصیات کو بھی

دیکھتا ہے۔ دانتے کے اس تعصّب کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس دور میں مسلمان قوم انٹلکچوئل سطح پہ بہت ترقی یافتہ قوم تھی۔ حساب، طب، سائنس، ریاضی، نجوم، ستارہ شناسی اور خاص طور پر ادب میں وہ اپنی ایک منفرد حیثیت متعین کر چکے تھے۔ عیسائی ابھی ان سے بہت پیچھے تھے اور یہی حسد دانتے کی شاعری میں زہر بھر رہا تھا۔ مسلمانوں کو ملعون و مطعون قرار دے کر وہ اور کچھ نہیں صرف اپنے چھوٹے پن کا اظہار کر رہا تھا۔ افسوس مسلمانوں نے اپنا وہ مقام برقرار ہی نہ رکھا اور مغرب کے رہنے والے علم کی دوڑ میں ان سے بہت آگے نکل گئے۔

علامہ اقبال نے بھی اپنی ایک نظم ''سیر فلک'' میں جنت اور جہنم کی سیر کا ذکر کیا ہے مگر علامہ نے وہاں کسی ایسے شخص یا قوم کو نہیں پایا جسے وہ ناپسند کرتے تھے۔ دانتے کے برعکس وہ تو جہنم کو سرد اور خنک پاتے ہیں، فرشتے سے پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے تو جواب ملتا ہے۔

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

کتنا فرق ہے شاعرِ مشرق اور مغرب کے ایک شاعر کی سوچ میں۔

میری بیٹی سمیرا نے بتایا کہ اس کے ایک کلاس فیلو بلال حیٔ نے جو نیویارک یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا، گیارہ ستمبر کے حوالے سے اپنی کلاس کے لیے ایک ریسرچ پیپر لکھا جو بہت سے متضاد حقائق بیان کرتا ہے۔ میں نے جب وہ پیپر منگوا کر پڑھا تو میں اس پاکستانی نوجوان طالب علم کی تعلیمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی جرأت اور بے نیازی کی قائل ہوگئی۔ جو کچھ بلال نے لکھا وہ ایسا تھا کہ اگر اس کے بعد اسے القاعدہ کا ممبر سمجھ لیا جاتا تو کسی کو حیرت نہ ہوتی مگر بلال ڈرا نہیں۔ پیپر لکھ کر ٹھاہ کر کے امریکن اساتذہ کے منہ پہ مارا اور اس بے یقینی کے ساتھ پاکستان واپس لوٹ گیا کہ

پتہ نہیں اب اسے دوبارہ اس درسگاہ میں داخلہ ملتا بھی ہے یا نہیں۔یہیں پر اگر میں امریکن نظام تعلیم کی تعریف نہ کروں تو وہ بھی انصاف نہیں ہوگا کیونکہ اس کے پیپر کو پڑھ کر نہ صرف یہ کہ اس کے اساتذہ نے اسے اے گریڈ دیا بلکہ اگلے سیشن میں داخلہ پر بھی اس کی راہ میں کوئی روڑا نہ اٹکایا۔

بلال نے اپنے پیپر میں یہ ثابت کیا ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے واقعے کا ذمہ دار صرف اور صرف امریکہ ہے اور کوئی دوسرا نہیں۔ان کے الفاظ کچھ یوں ہیں: "جارج آرول کہتا ہے۔

In war truth is the first casualty.

لہٰذا یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔سب کچھ جھوٹ پہ مبنی ہے۔اسامہ امریکہ کی پیداوار ہے اور اسرائیل اس کا ناجائز بچہ۔ان بلڈنگوں کے گرنے کے ساتھ ہی امریکہ کا یہ یقین بھی دھڑام سے نیچے آن گرا ہے کہ امریکہ ناقابل تسخیر، ہر خطرے سے بالاتر ہے۔اسے کبھی کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔جارج آرویل یہ بھی کہتا ہے:

war is peace, freedom is slavery, ignorance is strength

امریکہ کا تصور امن یہی ہے کہ ہر وقت حالت جنگ میں رہا جائے۔اس کی so-called آزادی دراصل غلامی ہے کیونکہ ان کے عوام بے خبر اور جاہل ہیں۔انہیں جان بوجھ کر لاعلم رکھا جاتا ہے تاکہ انہیں اصل حقائق کا کبھی علم نہ ہو سکے اور وہ اپنے ملک اور اس کی پالیسیوں کو ہمیشہ صحیح اور جائز سمجھتے رہیں کیونکہ عوام کی جہالت ہی امریکہ کی طاقت ہے۔امریکہ جو چاہے انہیں بتائے وہ اس پہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے ہیں۔"

مشہور امریکی مصنف Gore vidal نے بھی یہی کہا" کہ افغانستان کا تیل

حاصل کرنا امریکہ کا خواب تھا اور اس تیل کی پائپ لائن پاکستان سے گزارنا ایک مجبوری اس لیے اسے اس خطے میں ہر صورت قدم جمانا تھے۔ اسامہ بن لادن کو اس پروگرام کا علم ہو گیا اور اس نے امریکہ پر حملہ کر کے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ ہم ہی نے پہلے طالبان کو بنایا' روس کے خلاف لڑوا کر انہیں مجاہدین قرار دیا اور جب وہ ہمارے کہنے پہ نہیں رہے تو ہم ان کے خلاف ہو گئے۔"

مشہور امریکی پادری Jesse jackson نے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہوئے طنز کر کے کہا "گیارہ ستمبر سے پہلے آپ لوگ اپنے آپ کو سفید فام اور elite سمجھتے تھے مگر اب ہماری طرح آپ بھی سیاہ فام ہیں۔"

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اب اسلام کو امریکہ میں ایک Indentity crisis کا سامنا ہے۔ اسلام بدنام اور مس انڈرسٹوڈ مذہب ہو کر رہ گیا ہے۔ مسلمان یونہی خوامخواہ شرمندہ شرمندہ سے پھرتے ہیں کہ مسلمانوں کا نام اب صرف دہشت گردی کے حوالے سے آنے لگا ہے۔ افغان بھائی آپس میں لڑے' امریکہ نے اس انتشار کا فائدہ اٹھایا اور اسامہ کو ڈھونڈنے کے بہانے تورا بورا کی غاروں کو توڑا پھوڑا مگر اسامہ نہ ملا۔ امریکی بمبار طیارے Bomb and Bread پروگرام کے تحت بمباری کے ساتھ ساتھ خوراک کے پیکٹ بھی پھینکتے' یعنی درد اور دوا دیتے مگر سارا افغانستان چھان مارنے کے باوجود ان کی مراد بر نہ آئی۔ پاکستانی ملّا لیڈروں نے کئی ہزار پاکستانی نوجوان بچے جہاد کے نام پہ افغانستان پہنچا دیے اور خود پیچھے ہٹ کر ان کی غارت گری کا تماشا دیکھتے رہے حالانکہ جہاد کا اصلی مطلب تو اخلاقی جدوجہد' بہتری کی کوشش' فلاح و بہبود کی منازل طے کرنا ہیں۔ اس طرح کی بصارت تو جبھی حاصل ہو سکتی ہے جب آپ اجتہاد یعنی ذہن سے جہاد کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ بے مقصد لڑائی کے جہاد میں جانوں کے ضیاع کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ملّا عمر اور

اسامہ بن لادن نے لاکھوں افغانی مروا کر بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیا اور خود نہ جانے کہاں روپوش ہو گئے۔

آج امریکہ وسط ایشیا میں اپنے قدم پہلے سے زیادہ مضبوطی سے جما چکا ہے اور ساری دنیا کا چودھری بن چکا ہے مگر یہ ایک سپر پاور کی طاقت کے مظاہرے ہیں۔ وہ جہاں جی چاہے جو کچھ مرضی کرے اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ امریکہ نرم دل اتنا ہے کہ ایک مچھلی، کتے یا بلی کو بچانا ہو تو ملین ڈالر کے فنڈ جمع کر لے گا' اس کے برعکس ہمارے کلچر میں بے زبان جانوروں پہ رحم کرنے کا کوئی رواج نہیں' لیکن اگر امریکہ کو غصہ آ جائے تو وہ ایک جرثومے کے ذریعے پوری پوری قوموں کو نیست و نابود بھی کر سکتا ہے۔ وہ ایک کامیاب ملک ہے اور کامیابی اپنی اقدار خود تخلیق کرتی ہے۔ ہم نہ اتنے مضبوط ہیں نہ خود کفیل لہٰذا ہمیں ہر پل کشکول لیے امریکہ کی طرف دیکھنا پڑتا ہے اور اس کا ہر ستم برداشت کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ دنیا کا شہنشاہ ہے مگر اسے یہ شہنشاہی کمزور عوام کے وسائل پہ قبضہ جمانے' انہیں ڈرا دھمکا کر رکھنے پہ ملتی ہے تو اس میں اس کی تو کوئی بہادری نہیں۔

ابلیس کہتا ہے:

"میں نے دکھلایا فرنگی کو حکومت کا خواب"

اگر امریکہ حاکم کے بجائے اقوام کا دوست بنے' جیو اور جینے دو کے فلسفہ پر عمل کرے تو کوئی عجب نہیں کہ وہ بھی پھلے پھولے' تباہ نہ ہو۔ دوسری اقوام بھی چین کا سانس لے سکیں اور پوری دنیا میں امن قائم ہو جائے۔

اس وقت پوری دنیا ایک لحاظ سے دو طرح کی ہو کر رہ گئی ہے۔ خوش حال اور بدحال۔ زیادہ تر مغربی ممالک فراوانی اور معیاری زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں اور مشرقی ممالک پسماندگی اور افلاس کا شکار بن کر رہ گئے ہیں۔ Have

andHave nots کے آپس کے تناؤ کی وجہ سے جب مڈبھیڑ ہوتی ہے تو تباہی ہوتی ہے اور انسان لوہا یا شیشہ، سبھی کچھ مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو گزرے اب سال بھر سے اوپر کا عرصہ بیت چکا ہے اور اس مختصر مدت میں اس ستمگر ستمبر نے دنیا میں ایسی اتھل پتھل مچائی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس اللہ نگری کا ہوگا کیا؟ ایک وقت تھا کہ ماہ ستمبر کے ذکر ہی سے آنے والی خوبصورت رتوں کی مہک، بدلتے موسموں کے رنگوں کا تصور ذہن میں ابھرنے لگتا تھا۔ راک ہڈسن کی پرانی فلم come September کی مقبول عام دھن کانوں میں گونجنے لگتی تھی مگر اب یہ کیسے بے رحم دن ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

ماہ ستمبر میں اب رت نہیں بدلتی، گرمی کا موسم چلتا رہتا ہے۔ حبس بڑھ جانے سے سانس گھٹنے لگ جاتا ہے۔ کوئی پرانا میٹھا نغمہ یاد نہیں آتا۔ ستمبر کا ذکر سنتے ہی ذہن کے پردے پہ ایک خوفناک سی فلم چلنے لگتی ہے جس میں بلڈنگوں سے ٹکراتے ہوئے جہاز، جلتے ہوئے انسان، اس کے بعد کی انتقامی بمباری، خون خرابہ، مسلمانوں کے خلاف جنگ، افغانی بھائیوں کے آپس میں قتل و غارت کے مناظر، آنکھوں کے آگے ناچنے لگتے ہیں۔ آج دنیا کے سبھی لوگ سہمے ہوئے دل لیے پریشان بیٹھے ہیں کہ دہشت گردی کا جن بوتل سے باہر آ چکا ہے اور چاروں طرف اس کی ہیبت طاری ہے۔ ماں باپ پریشان ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو آنے والے دنوں میں ایک مرجھائے ہوئے مستقبل کے علاوہ کیا دے سکیں گے؟ اس بے یقینی کے دور میں اب کسی کو کسی چیز کا بھی یقین بھی تو نہیں رہا۔

دنیا میں جب کبھی کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا ہے تو ہم چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ضرور یاد رکھتے ہیں اور زندگی بھر بھلا نہیں پاتے۔ مجھے آج تک اپنے بچپن کا وہ دن یاد ہے جب میں نے امریکی صدر کینیڈی کے قتل کی خبر سنی تھی۔ پھر بھٹو کی

پھانسی، ضیاء الحق کے ائیر کریش کی خبر والے دن بھی مجھے پوری طرح یاد ہیں اور یاد رہیں گے۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کا سانحہ بھی ایسا ہی ایک اہم واقعہ ہے کہ آج کے دور کا کوئی باشعور انسان اسے بھلا نہیں سکے گا۔ ہم سب کو یاد رہے گا کہ جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارتیں گریں تو ہم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ امریکہ میں لوگوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹرز کی تصاویر والے پوسٹرز اور ویو کارڈز خرید کر سنبھال لیے ہیں کہ ہمارے بچے اپنے بچوں کو دکھائیں گے کہ دیکھو یہ تھیں وہ تاریخی عمارات۔ جن کی وجہ سے دنیا میں اتنی بڑی تبدیلیاں آئیں اور لائیں گئیں۔ یہ تھے ہماری عظمت کے وہ نشان جنہیں اتنی سفا کی سے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا کہ آج ان کے ہونے کا کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا۔

سال ۲۰۰۲ء میں ستمبر کی آمد سے پہلے سمر سیزن کے آغاز سے ہی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے میدان میں رات کے وقت دو بڑی بڑی خوبصورت، چوڑی متوازی، نیلے نگ کی لیزر بیم لائٹیں زمین سے آسمان تک پھینکنے کا انتظام کیا گیا۔ ان دو لائٹوں کو سیدھا اوپر جاتا دیکھتے تو لگتا جیسے گیارہ کے ہندسے کی سیڑھی اوپر تک جا رہی ہو اور وہ ٹھنڈی نیلی روشنیاں مرنے والوں تک اپنا عقیدت بھرا اسلام پہنچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سارا ماحول پراسرار اور ماورائی سا دکھتا اور عقل حیرت میں گم ہو جاتی تھی۔ ستمبر گزرتے ہی وہ لائٹیں آف کر دی گئیں جن کے ساتھ ہی گراؤنڈ زیرو کا علاقہ تاریک اداسی میں ڈوب گیا۔ پہلے کی نسبت اب زیادہ تعداد میں آنے والے سیاح، کیمروں سے تصویریں کھینچتے، زمین پہ پھول رکھتے، آپس میں ایک دوسرے کو شدت جذبات سے گلے لگاتے اور پھر خاموشی سے الٹے قدموں واپس لوٹ جاتے کہ ان کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں اور ذہن ماؤف۔ لوگ اب بھی وہاں جا کر چپ سے رہ جاتے ہیں۔

میں اور بچے بھی دوبارہ گراؤنڈ زیرو کا خالی منہ چڑاتا میدان دیکھ کر خاموشی سے واپس آ گئے۔ علامہ اقبال کا شعر ارد گرد پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

آج کل نیویارک میں اس بات پر بہت سوچ بچار ہو رہی ہے کہ گراؤنڈ زیرو کا کیا کیا جائے۔ ایک خیال ہے کہ مرنے والوں کی یاد میں وہاں ایک میموریل پارک بنایا جائے۔ دوسرا یہ کہ انہی ٹاورز کو دوبارہ اسی صورت تعمیر کیا جائے تا کہ اہل نیویارک کو ان کے لینڈ مارکس واپس مل جائیں حالانکہ یہ تو طے ہے کہ اگر ایسا ہو بھی گیا تو پہلے والی بات تو پھر کبھی نہیں ہو سکتی۔ لوگ انھیں منحوس سمجھ کر شاید دوبارہ ان میں کبھی گھسیں بھی نہیں اور وہ خالی کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔

ع...... نقش دائم تو فقط دست قضا نے لکھا۔

دوبارہ ویسے کہاں بن سکتے ہیں؟

نیویارک کے شہری آپس میں پھر سے مل جل کر رہنے کی کوشش میں مصروف ہو چکے ہیں۔ یہ شہر الجھا ہوا اور سادہ بھی ہے۔ محبت بھرا اور نفرت زدہ بھی ہے، لیکن پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔ جس شہر نے ہمیشہ ایک لاڈلے شہر کی سی زندگی گزاری ہو اور اس پہ اتنی ضرب کاری لگی ہو تو اس میں مختلف قسم کے ردعمل کا ہونا تو ایک لازمی بات ہے۔

میری بہن سنبل بھی ۲۰۰۲ء میں دوبارہ امریکہ آئی ہوئی تھی۔ اس نے اب کی بار امریکہ کو ایک مختلف دور اور رنگ میں دیکھا تو اپنی طرز کے کئی دلچسپ تبصرے کرتی رہی جن سے ہم محظوظ ہو کر ہنستے رہتے۔ ایک بار جب ہم لوگ کسی ہوٹل میں ٹھہرے تو آپریٹر نے کھانا بھجوانے کے بعد کم از کم چھ بار فون کر کے پوچھا کہ کھانا ٹھیک ہے؟ ہمیں کچھ اور تو نہیں چاہیے؟ ان کی اس خوش اخلاقی سے سنبل بڑی متاثر ہوئی اور کہنے لگی ”کتنے تمیز دار لوگ ہیں یہ اور ہم نے انہیں جہاز مارے ہیں، توبہ توبہ!“ اسی طرح جب ہم سڑک پہ پیدل چل رہے ہوتے اور سڑک پار کرتے ہوئے دونوں

طرف کی ٹریفک رک جاتی تو وہ حیرت سے منہ میں انگلیاں داب لیتی اور پھر کہتی "ہائے اتنے تمیز دار اور خیال رکھنے والے لوگ ہیں یہ ہم نے انہیں جہاز مارے ہیں؟ بڑا افسوس ہے۔"

سنبل کے ان بظاہر مزاحیہ کمنٹس میں بہرحال ایک حقیقت تو پنہاں تھی کہ اس ملک کے روزمرہ طور طریقوں اور اصول پرست نظام کی واقعی داد دینا پڑتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو لحاظ، تمیز، رواداری اور civic sense تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم تعلیم و تہذیب، تعمیری ترقی میں ان سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ شرح آبادی بڑھا کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے کوئی خدائی کام سرانجام دے دیا ہے حالانکہ خدائی کام تو یہ ہے کہ اپنے ملک میں پہلے سے پیدا شدہ بچوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کی جائیں۔ انہیں خوراک، صحت، تعلیم، تحفظ دے کر معاشرے کا فعال رکن بنایا جائے مگر پتہ نہیں ہم لوگوں کو کب اور کیونکر سمجھ آئے گی؟

اب پاکستانی لوگ امریکہ میں بڑی احتیاط سے زندگی گزارنے کی کوشش کر رہے ہیں اور امریکی معاشرے میں مدغم ہونے کی خاطر پہلے کی نسبت ان کے طور طریقوں سے رہنے کو زیادہ ترجیح دینے لگے ہیں۔ پاکستانی خواتین کسی تمیز و تفریق کے جھنجھٹ میں پھنس جانے کے ڈر سے اب زیادہ تر امریکی لباس پہننے لگی ہیں۔ میں نے بھی اب کی بار باہر آنے جانے کے لیے زیادہ تر اسی قسم کا لباس اختیار کیا۔ مجھے تیس برس پرانا وہ دن یاد آ گیا جب شروع شروع میں ایک بار میں شلوار قمیض پہن کر ایک ڈاکٹر کے کلینک چلی گئی تھی۔ اس زمانے میں شلوار قمیض امریکنوں نے کہاں دیکھ رکھی تھی لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھ کر بڑی معصومیت سے پوچھا "اچھا تو یہ لباس پہن کر آپ اپنے اونٹ پہ سواری کرتی ہیں؟" مجھے غصے کے بجائے ہنسی آ گئی تھی۔ اب ڈاکٹر صاحب کو کیا سمجھاتی؟

پھر ۸۰ء اور ۹۰ء کی دہائیاں گزریں جن میں سارے امریکہ میں انڈین اور پاکستانی لوگوں کی اتنی آبادی ہو گئی کہ شلوار قمیض میں نظر آنا کوئی عجوبے کی بات نہیں رہی۔ عجیب بات تو اب ہو رہی تھی کہ گردش ایام پیچھے کی طرف لوٹ رہی تھی۔ ہم لوگ اپنا لباس پہننے سے کترانے لگے تھے اور ان جیسے نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے جن کے ملک میں ہم رہ رہے تھے۔

نیو یارک میں جیکسن ہائٹس کوئینز کا بازار لاہور کے انار کلی بازار جیسا ہے۔ وہاں کپڑے، جوتے، کچن کا سامان، کتابیں، اخبار، سبزی، پھل غرضیکہ ہر دیسی چیز مل جاتی ہے۔ نیو یارک قیام کے دوران جب میں ذرا ہوم سک ہونے لگتی ہوں تو عنبر سے کہتی ہوں ”مجھے جیکسن ہائٹس لے چلو، میری کلچرل starvation کو ذرا آرام آ جائے۔ ہم لوگ وہاں جاتے ہیں، شلوار قمیض، ساڑھیوں، زیوروں میں ملبوس خریداری کرتی عورتوں، پگڑیوں والے سکھوں کو دیکھتے ہیں، دیسی کھانا کھاتے ہیں تو چین پڑ جاتا ہے۔ وہاں کئی بار ایسا میوزک، سبزی پھل مل جاتا ہے جو اب پاکستان میں بھی نہیں ملتا۔ صاف ستھرے پیک میں بکتی کچی سبز املی دیکھ کر مجھے اپنا کراچی میں گزرا ہوا بچپن یاد آ جاتا ہے جب میں سکول میں لگے درختوں سے اسی طرح کچی املی توڑ کے کھایا کرتی تھی...... جانے کہاں گئے وہ دن۔

اب کے برس بھی میں عنبر اور اس کی انڈین سہیلی گائتری، کدو، کریلے لینے جیکسن ہائٹس گئے تو ہم نے حسب معمول چاٹ، دہی بھلے کھائے، پان چبایا اور افغانی ریسٹورنٹ سے کباب پیک کروائے۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد جیکسن ہائٹس کے دکانداروں کے بزنس پہ بھی کافی اثر پڑا مگر اب دھیرے دھیرے حالات کچھ بہتر نظر آنا شروع ہو رہے تھے۔ عنبر اور گائتری کی دوستی دیکھ کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش جس طرح ہم بیرون ملک اپنے ہمسایہ ملک کے لوگوں سے دوستی کر لیتے

ہیں، اپنے برصغیر میں رہتے ہوئے بھی کر سکیں...... مگر افسوس ایسا ہونا مشکل سے مشکل نظر آتا جا رہا ہے۔ امریکہ میں پیدا ہونے والی انڈین پاکستانی بچے آپس میں بلا کسی تمیز و تفریق کے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کے اچھے دوست بھی ثابت ہوتے ہیں۔ سیاسی لڑائیوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا اور جب وہ ہم بڑوں سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان تنازعے کی فضا کب ختم ہوگئی تو ہم اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پاتے۔

ابا امی بھائی سے ملنے امریکہ آئے تو نیویارک ائیر پورٹ پہ امیگریشن افسر نے ابا کا پاسپورٹ دیکھا پھر بیٹے کے امریکن شہری ہونے کا علم ہونے پہ بے ساختہ کہا ''اب تو آپ یہاں مستقل رہائش کے لیے اپلائی کر دیں گے، ہیں نا؟''

"why should I" ابا نے تمکنت سے جواب دیا۔ میں اپنے ملک واپس جاؤں گا اور کیا امریکہ امیریگرنٹس کا ہی ملک نہیں؟ کیا تم ریڈ انڈین نسل سے تعلق رکھتے ہو؟'' ابا کی ان باتوں سے افسر لاجواب ہوگیا اور خاموشی سے ان کے پاسپورٹ پہ ٹھپہ لگا دیا۔

دراصل وہ لوگ بھی سچے ہیں۔ پاکستانی ایک بار امریکہ کی سرزمین پہ پہنچ جائیں تو واپس کب جاتے ہیں۔ پھر امریکی سسٹم میں رچ بس کر بڑے دھڑلے سے کریڈٹ کارڈ، فون کارڈ بل کے فراڈ کرتے ہیں اور مہارت سے ایسے چکر چلاتے ہیں کہ امریکن منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اب تو امریکہ میں بھی رشوت سسٹم چلنے لگا ہے۔ جہاں جہاں جس جس محکمے میں پاکستانی ہوتے ہیں، رشوت لے کر جلدی اور بآسانی کام نکلوا دیتے ہیں۔ جسٹ لائک ہوم۔

سیدھی سی بات ہے امریکہ دنیا کے اتنے لوگوں کو پالتا ہے، انہیں اپنے ملک میں روزی کمانے دیتا ہے مگر اپنی خارجہ پالیسیوں کے ذریعے من مانی اور زور آوری کرتا

ہے۔ یہ بات پیچھے رہ جانے والے ملکوں کو بہت ناگوار گزرتی ہے اور وہ جواب میں دہشت گردی پہ اتر آتے ہیں۔ امریکہ سپر پاور ہے، دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے، لیکن ایسا بادشاہ جو چاہتا ہے کوئی اسے ننگا نہ کہے بلکہ سارا جہان اس کی خلعت شاہی کی تعریف وتوصیف میں اس کے آگے جُھک جُھک جائے۔

کیلی فورنیا میں زلزلے بہت آتے ہیں۔ اب کے بار جب میں لاس اینجلس گئی تو نئے نئے، بڑے بڑے جدید ہاؤسنگ پراجیکٹس تعمیر ہوتے دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ جب مجھے بتایا گیا کہ ہر بلڈنگ کی بنیاد ایک بڑے سے رولر پہ رکھی گئی ہے تاکہ وہ زلزلے کے وقت ٹوٹنے پھوٹنے کے بجائے صرف سائڈ پہ ہی جھولے لیتی رہے تو میں امریکنوں کے علم، عقل اور تدبیری صلاحیتوں کی مزید قائل ہوگئی۔ یہ محنتی قوم کام کرنا جانتی اور چاہتی ہے۔ حکمرانوں کی لوٹ مار سے بچی ہوئی ہماری قوم کام چور اور نان پریکٹیکل ہے تو پھر ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمیں ان کی سطح پہ آنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ خالی خولی باتوں سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ان کی برابری کرنے کے لیے ابھی بہت جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ہمارے مذہب کا پہلا لفظ ہی ''اقراء''یعنی پڑھ ہے، لیکن ہم علم اور عمل سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ امریکہ میں گلی گلی محلے محلے فری لائبریری سسٹم ہے جو شہریوں میں پڑھنے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جبکہ ہمارے ہاں کی لائبریریاں سسک سسک کر دم توڑ رہی ہیں۔ ایک عام آدمی تک ان کی رسائی ہی نہیں ہے کیونکہ لائبریریوں کے قاعدے قانون اتنے مشکل ہیں کہ وہاں سے کتاب حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم بات نہیں ہوتا۔ کتابوں کی حالت زار اور چوری کی داستان ایک الگ موضوع ہے۔ امریکہ میں باقاعدگی سے لائبریری جانا (کم از کم میرے لیے تو) روز کے معمولات میں شامل ہوتا ہے جہاں میں آرام سے جا کر کتابیں، رسالے، فلمیں

لاتی ہوں اور مجھے کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا۔ میں سوچتی ہوں جس ملک میں عوام کو اتنی آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہوں اس کے پرزے اڑانا اتنی آسان بات نہیں، لیکن کبھی کبھی جب ٹی وی پہ آنے والے Jerry springer ٹائپ شوز دیکھتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ یہ امریکہ کس طرف جا رہا ہے۔ لبرل ازم اور آزاد خیالی حد سے گزر جائے تو معاشرتی انحطاط کی پستیوں کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

افسوس کہ مغربی میڈیا کی طاقت کی وجہ سے اسی قسم کے معاشرتی تضادات، بدلتی ہوئی اقدار کے جراثیم پوری دنیا میں پھیلتے جا رہے ہیں۔ دنیا کے سبھی معاشرے اور تہذیبیں (بشمول پاکستان) تیزی سے اس کی لپیٹ میں آ رہے ہیں۔ اور ہم بے بسی سے سوچ رہے ہیں کہ اب کیا کریں؟

امریکہ میں مشہور فلم میکر سٹیون سپیل برگ Steven Spielberg کی فلم AI Artificial Intelligence دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس کا آخری سین دیکھ کر میں کانپ کر رہ گئی۔ سپیل برگ نے یہ فلم گیارہ ستمبر کے حادثے سے پہلے بنائی تھی لیکن حیرت انگیز طور پہ فلم کے آخری سین میں کچھ الہامی اشارات شامل ہو گئے تھے، جن کا فلم میکر نے شاید خود بھی شعوری طور پر ارادہ نہ کیا ہوگا۔ فیوچرسٹک نظریہ سے بنائی گئی اس فلم کا ہیرو ایک دس بارہ سالہ بچہ ہے جسے فلم میں اختتام سے پہلے ایک آبدوز میں بند کر کے سمندر میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب وہ آبدوز نیچے جاتی ہے تو دیکھتی ہے کہ پانی میں پورے کا پورا نیویارک شہر ڈوبا ہوا ہے۔ اس کی تمام سکائی سکریپر عمارات زیر آب آ چکی ہیں اور سطح پہ زندگی یا شہر کا کوئی نام ونشان نہیں۔ یہ دیکھ کر میرے تو دل میں ہول سے اٹھنے لگے اور مجھے قرآن پاک کی وہ آیت یاد آ گئی جس میں اللہ فرماتا ہے کہ ''کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا ہے۔'' (سورۃ الانبیاء)

کیا نیویارک بستی بھی یوں..........

اللہ چاہے تو کیا نہیں کرسکتا۔ امریکہ جیسے مضبوط ترقی یافتہ ملک کو بھی صفحہ ہستی سے غائب کرسکتا ہے لیکن یہ تو میں ہر گز نہیں چاہوں گی کہ اس عالم میں انتخاب شہر کا ایسا انجام ہو کیونکہ وہاں بھی انسان بستے ہیں۔ میرے بچے، عزیز و اقارب، دوست بلکہ آدھا پاکستان رہتا ہے۔ میں ان کے لیے دعائے خیر کے علاوہ اور کیا مانگ سکتی ہوں؟ خدا کرے وہ اپنے خطے میں خیریت سے رہیں اور ادھر ہم اپنے حصے میں چین سکون سے زندگی بسر کریں۔ ان کی طرح ہمارے شہروں میں بھی زندگی ہنستی کھیلتی نظر آئے، بچے گلوں میں بستے ڈالے صبح کو سکول جائیں اور واپس آ کر اپنی ماؤں کے ہاتھوں کا پکا کھانا کھائیں۔ ان کے باغوں میں چڑیاں چہکیں تو ہمارے آنگن میں بھی موتیا مہکے۔ دنیا آباد رہے، شاد رہے، لیکن کیا یہ صرف اب ایک دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا؟

میں تو سمجھتی ہوں دنیا کے سبھی لوگ آپس میں بہن بھائی ہیں کیونکہ سب ایک ہی آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔ یہ صرف میری ہی خام خیالی نہیں، اس بات میں کچھ حقیقت بھی ہے۔ علم جغرافیہ ہمیں بتاتا ہے کہ دو سو ملین سال پہلے ساری دنیا کی زمین ایک بڑے سے ٹکڑے کی صورت میں تھی جسے panagea کہا جاتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے زمین میں بے چینیاں پیدا ہوئیں، اس نے کروٹیں لینا شروع کر دیں اور اس کے کنارے سمٹنے لگے continental drift ہوا یعنی براعظم کھسکنے لگے اور سمندر بیچ میں ظالم سماج بن کر لیٹ گیا۔

ایک تھیوری کے مطابق ایشیا اور امریکہ کے براعظم ایک دوسرے سے قریب ترین تھے۔ خاص طور پہ پاکستان اور امریکہ تو بالکل ہی ہمسائے تھے اسی لیے امریکہ میں رہنے والے اصل امریکن بھی گندمی مائل رنگت کے تھے جنہیں بعد میں ریڈ انڈین کہہ کر پکارا گیا۔ آج بھی جب ماہرین مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں یہ بات اچنبھے میں ڈال

دیتی ہے کہ ان کی اور ہماری قدیم تہذیبوں کے درمیان کافی مماثلت موجود ہے۔ واللہ عالم بصواب! تو پھر امریکہ اور ہم اتنے اجنبی تو نہ ٹھہرے۔ ایک ہی ہوئے نا...... اب ان گوروں کو یہ کون سمجھائے؟

میں تو دونوں ملکوں کی خیر و بقا میں ہی دلچسپی رکھتی ہوں کیونکہ دونوں ہی میں میرے گھر، میرے گھر والے رہتے ہیں۔ دونوں ہی مجھے محبوب اور عزیز ہیں۔ میں کسی کا بھی برا نہیں چاہ سکتی۔

کولمبس جب سونے کی تلاش میں پہلی بار امریکہ آیا تو اس کے جہاز میں ایک قیدی عورت بھی تھی۔ روایت ہے کہ جب کولمبس نئی دنیا دریافت کرنے کے بعد واپس پرتگال پہنچا تو وہ عورت جہاز سے اترتے ہی دوڑ کر اتری اور اپنی سرزمین کی مٹی کو چومنا شروع کر دیا۔

کبھی کبھی میں خود کو اسی عورت کی طرح لگتی ہوں جو سنہری مستقبل کی تلاش میں جہاز پہ سوار ہو کر امریکہ تو چلی گئی تھی لیکن اپنے وطن کی مٹی چومنے کے لیے بار بار وطن واپس آتی ہے۔ دونوں ملکوں کی گزرگاہوں میں بھٹکتی ہے راہ پا لیتی ہے، لیکن شکر ہے کہ گم نہیں ہوتی۔ میرے جیسے بہت سے امیگرنٹ لوگ اب ٹکڑوں میں جی رہے ہیں۔ میری ذات کا ایک ٹکڑا امریکہ میں، ایک پاکستان میں اور جگر کے تین ٹکڑے بھی وہیں کہیں ہیں جہاں ان کا جنم ہوا تھا اور جہاں ان کی زندگی گزرے گی۔

میں کوئی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والی گیانی دھیانی ہستی نہیں ہوں۔ میں تو ایک عام عورت، ایک ماں ہوں جسے انتقام یا خون خرابے سے کوئی دلچسپی نہیں، مگر زیادتی اور بے انصافی سے نفرت ضرور ہے۔ مجھے اپنے اور دنیا کے بچوں کے لیے امن اور سکون سے بھرے صاف ستھرے دن چاہئیں مگر آج کی دنیا اپنے آپ کو تباہ کرنے پہ تلی ہوئی ہے۔ انسان انسان کو کاٹ رہا ہے، جلا رہا ہے، کھا رہا ہے۔ اور اللہ میاں بائیسکوپ میں

سے ہمارا تماشا دیکھ رہا ہے۔اس کے آ گے مختلف قسم کے سین ہیں' کئی قسم کے فریم ہیں
کسی میں بم' شعلے' دھماکے' خون اور چیخ کی تصویر ہے تو کسی میں گلابوں کی مہک' بچوں
کی ہنسی' موسیقی کے سر اور دھنک کے رنگ دکھائی دے رہے ہیں۔
شاید اللہ بھی حیران ہو رہا ہے کہ ان انسانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ میرے نائب دنیا میں
کتنا فساد مچا رہے ہیں؟ دنیا کو وقت سے پہلے ہی منزلِ فنا کی طرف لیے چلے جا رہے
ہیں۔میں تو خود دن رات سوچتی ہوں کہ آنے والے بچوں کے لیے ہم کیسی دنیا چھوڑ
کر جائیں گے۔اللہ میاں تھلے آ اور آ کر ہمیں اپنی آغوش میں لے لے ہمیں
سنبھال۔اللہ میاں۔